جولائی ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ چھ روپے پچاس پیسے

Regd, No L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore.

JULY 1963

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قران (قران فہمی کی رہنما)		3—25
تدبر قران (تفسیر آیہ بسم اللہ و سورہ فاتحہ)		0—75
اسلامی قانون کی تدوین	3—00 و	2—00
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ		2—25
تزکیہ نفس	6—00 و	3—75

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد ص	22—50
(آنحضرت ص) سیرت ابن ہشام	10—00
ابو بکر رض صدیق اکبر	10 - 00
عمر رض فاروق اعظم	20—00
امام اعظم رح	4—00
حیات امام احمد بن حنبل رح	10—00
آثار امام شافعی رح	12—00
حیات امام مالک رح	10—00
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح	21—00
زاد سفر (حصہ اول)	3—75
قاد یانیت	4—00
ISLAM & THE WORLD	4—00

مکتبہ میثاق (رحمان پورہ) - اچھرہ لاہور - 12

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۹ | صفر المظفر ۱۳۸۳ ہجری | شمارہ ۱

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ	امین احسن اصلاحی	۲
تدبر قرآن		
تفسیر سورہ بقرہ	امین احسن اصلاحی	۹
افادات فراہیؒ		
شانِ نزول	امین احسن اصلاحی	۳۴
مراسلہ و مذاکرہ		
جمال عبدالناصر اور نعرہ اتحادِ عرب	امین احسن اصلاحی	۳۸
مقالات		
تاریخ جمع و تدوین قرآن	حافظ نذر احمد صاحب	۴۱
اقتباسات و تراجم		
سیاستِ نبویؐ کا ایک اہم پہلو	جناب خالد مسعود صاحب	۴۹
تقریظ و تنقید		۵۵

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمانپورہ ــ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندستانی خریداروں کیلئے ترسیلِ زر کا پتہ
منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"
باغ گونجے نواب ــ لکھنو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

تذکرہ و تبصرہ

پچھلے دو مہینوں میں ہمارے ملک کے دونوں بازو دو مختلف قسم کے طوفانوں سے نہایت بُری طرح مجروح ہوئے۔ ہمارے لئے، اگر ہم دیدۂ عبرت رکھنے والے ہوتے تو اُن حوادث کے اندر بڑی نصیحتیں موجود تھیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارا حال اس وقت بالکل وہی ہو چکا ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (۱۰۵۔ یوسف) "آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جو لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لئے ظاہر ہوتی رہتی ہیں لیکن لوگ ہیں کہ ان سے آنکھیں بند کئے گذر جاتے ہیں۔"

مشرقی پاکستان کے طوفان سے جو جانی و مالی نقصان ملک کو پہنچا ہے۔ اس کی مبالغہ آمیز رپورٹیں، جو سیاسی لیڈروں کی طرف سے اخبارات میں شائع ہوئی ہیں، اگر نظر انداز بھی کر دی جائیں، صرف سرکاری رپورٹ ہی پر اعتماد کیا جائے، تب بھی نقصانات کی مقدار ہوش اُڑا دینے کے لئے کافی ہے۔ وزیرِ خزانہ نے قومی اسمبلی میں نقصانات سے متعلق جو بیان دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طوفان سے ۳۱ ہزار مربع میل کا علاقہ، جو ۳۰ لاکھ کی آبادی پر مشتمل ہے، متاثر ہوا۔ سات ہزار تین سو افراد ہلاک ہوئے، چار ہزار افراد لاپتہ ہیں، ۲۵۰ ہزار مویشی سیلاب میں بہہ گئے، تین لاکھ جھونپڑے بالکل تباہ ہو گئے اور دس لاکھ جھونپڑیوں، ایک ہزار پرائمری اسکولوں اور چھ کالجوں کو جزوی نقصانات پہنچے۔

طوفان کی ہولناکی کا ایک سرسری اندازہ ذیل کی سطروں سے کیجئے جو ایک عزیز دوست کے ایک تازہ خط سے ماخوذ ہیں۔

"چاٹگانگ میں اس مرتبہ جو طوفان آیا اس کا زور ساحلی علاقوں میں زیادہ تھا اور یہ طوفان پہلے طوفان سے کہیں زیادہ ہولناک تھا۔ ۲۷ مئی کی شام کو ہوا میں تیزی شروع ہوئی۔ ۲۸ مئی کی رات میں جوں جوں رات بڑھتی گئی طوفان بڑھتا گیا اور ہوا کے ساتھ بارش میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ بارش وُہ کہ معلوم ہو کہ طوفانِ نوح کے لئے آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں، ہوا کا زور وہ کہ معلوم ہو کہ قومِ عاد کا عذاب ٹوٹ پڑا ہے۔ ہوا اور پانی دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور ان کی اس جنگ میں معلوم ہو رہا تھا کہ بس اب اس دنیا کا خاتمہ ہے۔......... یہ طوفان چودہ گھنٹوں کے بعد ختم ہوا...... کاکس بازار سے فینی تک چھوٹے چھوٹے تمام جزائر کی آبادیاں موجوں کی نذر ہو گئیں اور ساحلی آبادیاں ہوا کے زوردار تھپیڑوں اور بارش کے بے پناہ حملوں کے لپیٹ میں آ کر موت کے آغوش میں پہنچ گئیں۔ بس عبرت کے لئے کہیں کہیں کچھ نفوس بچ رہے ہیں لیکن عبرت کون حاصل کرتا ہے؟ جو بچ رہے ہیں ان کے دل معلوم ہوتا ہے پتھر کے ہو گئے ہیں۔ وہ لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ سابقہ طوفان کے بعد سے ہمارے شہر میں عموماً خدا سے بے خوفی بڑھتی جا رہی ہے۔ کچھ ماحول ہی ایسا بنتا جا رہا ہے......!!"

طوفان جیسا کچھ سخت تھا وہ تو تھا ہی اس سے زیادہ قابلِ ماتم وہ حالت ہے جو اس قسم کے کسی طوفان قیامت کے بعد بچ بچنے والوں کی ہے اور جس کی طرف مکتوب نگار نے نہایت دل سوزی کے اشارہ کیا ہے۔ اس طوفان سے پہلے بھی ہمارے یہ بھائی اسی قسم کے طوفان کی ہولناکیاں دیکھ چکے ہیں اور اس کے بعد بھی اخبارات میں اسی علاقہ سے متعلق سیلاب کی تباہ کاریوں کی وحشتناک خبریں برابر آ رہی ہیں۔ لیکن اب ہمارے اوپر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اتنا غالب ہو چکا ہے کہ قدرت کی سخت سے سخت تنبیہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ ہم میں سے اکثر لوگ تو اس قسم کے حوادث کو صرف اتفاق پر محمول کر کے گذر جاتے ہیں، اس کے اسباب و علل کی کرید میں پڑنے کی وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ لوگ اس کرید میں پڑنے کی زحمت

اٹھاتے بھی ہیں تو ان کی نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی کہ محکمہ موسمیات نے طوفان کی پیشنگوئی کرنے میں غفلت کی، فلاں احتیاطی تدبیر اختیار کرنے میں حکومت نے سستی کی، فلاں دریا کا بند نہایت کمزور اور بھس پھسا باندھا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس پہلو کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی کہ اس کائنات کا کوئی خدا بھی ہے جس کو اس دُنیا کے معاملات سے براہِ راست تعلق ہے اور جو کچھ بھی یہاں ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے اور نہ اس بات پر کوئی دھیان دیتا کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ اس میں اتنے بڑے بڑے واقعات محض نظامِ قدرت کی مشین کی کسی خرابی سے بس یوں ہی پیش آجائیں بلکہ ان کے سوتے خود ہمارے اپنے اخلاق و اعمال کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جھنجوڑنے اور اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لئے برابر ان کو چھوٹی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ یہ آزمائشیں کبھی کسی کو پیش آتی ہیں، کبھی کسی کو لیکن قدرت کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس سے عبرت سب ہی حاصل کریں۔ وہ بھی جو اس ابتلاء کی زد میں آئے اور وہ بھی جو اس سے محفوظ رہے، بلکہ جو محفوظ رہے ان پر دُہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ایک عبرت حاصل کرنے کی اور دوسری شکر گزاری کی کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کو اس آفت سے محفوظ رکھا۔ ان دونوں باتوں کا تقاضا ایک تو یہ ہوتا ہے کہ یہ توبہ اور اصلاح کریں اور دوسرا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی ایسی فیاضی اور ہمدردی کے ساتھ امداد کریں کہ اس شکر گزاری کا حق ادا ہو جائے جو اس آفت سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے ان پر عائد ہوتا ہے۔

جو لوگ ان واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کو خدا کی طرف سے سمجھنے کی بجائے ان کو محض اتفاق پر محمول کرتے ہیں، یا ان کی علت اپنے اعمال و اخلاق کے اندر ڈھونڈنے کی بجائے ان کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتے ہیں، یا اپنے آپ کو ان کا سزاوار سمجھنے کے بجائے اس چیز کو قدرت کا ایک ظلم سمجھتے ہیں، یا اس کو استحصال کا یا سیاسی پروپگنڈے کا ذریعہ بناتے ہیں، ان لوگوں کو قرآن قسی القلب اور سنگ دل قرار دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے یہاں تک کہ جب ان کے اندر خدا کی تنبیہات سے فائدہ اٹھانے اور توبہ و اصلاح کی صلاحیت بالکل مردہ ہو جاتی ہے تو وہ ان کو اپنے اس عذاب میں پکڑتا ہے جو ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے اور جس سے نجات دینے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔ اس عذاب کے بعد اس قوم کی قومی ہستی بالکل فنا ہو جاتی ہے اور خدا کا وہ قانون نمودار ہو جاتا ہے جو اس نے ایک قوم کو دوسری قوم سے بدل دینے کے لئے بنایا ہے۔

اس طرح کے عظیم واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے معاملہ میں مسلمانوں کو بالعموم اور ان کے ذمہ داروں اور لیڈروں کو بالخصوص جس درجہ حساس، زیرک، خدا ترس اور بیدار مغز ہونا چاہیئے اس کی بہترین مثال ہم کو حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں ملتی ہے۔ ان کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑا جس کا ذکر تاریخوں میں عام الرمادہ کے نام سے ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے اس قحط کے دنوں میں قحط زدوں کی امداد کے لئے اپنے رات دن ایک کر دیئے۔ ایک ایک دروازے اور ایک ایک جھونپڑے پر پہنچتے اور لوگوں کی مشکلات بنفسِ نفیس حل کرتے، راتوں کو گشت کرتے اور اگر کسی گھر میں بھوک سے بلکنے والے بچوں کی آواز سن پاتے تو خود اپنی کمر پر آٹے کی بوری لاد کر اور ہاتھ میں روغن کا ٹین لٹکائے ہوئے وہاں جا پہنچتے، خود چولہا پھونکتے اور جب تک بھوکے آسودہ نہ ہو جاتے اس وقت تک وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیتے۔ بھوکوں کے احساسات سے قریب تر رہنے کیلئے گھر کے اندر کھانا کھانا انہوں نے چھوڑ دیا۔ پورے زمانہ قحط میں اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر رکھی کہ نہ دودھ استعمال کریں گے، نہ گھی اور نہ کوئی دوسری لذیذ چیز۔ ایک دن اسی دوران میں اپنے کسی چھوٹے بچے کے ہاتھ میں خربوزے کی ایک پھانک دیکھ لی۔ دیکھتے ہی اس کے پیچھے بھاگے کہ "برخوردار! تم خربوزے اڑا رہے ہو اور اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قحط سے تباہ ہو رہی ہے۔" انتظامیہ کی سرگرمیوں کا اندازہ خود خلیفہ کی سرگرمیوں سے کر لیجئے۔ ان کا ایک ایک عامل اور ایک ایک گورنر انہیں کی طرح قحط کو شکست دینے کے لئے اپنی پوری قوت سے میدان میں اُتر آیا۔ ان کے عراق کے گورنر نے ان کو لکھا کہ "امیر المؤمنین! آپ قحط کے حالات سے پریشان نہ ہوں، میں غلہ کے اُونٹوں کا جو قافلہ بھیج رہا ہوں اس کی قطار کا اگلا اُونٹ مدینہ میں ہوگا اور اس کا آخری اُونٹ عراق میں"۔

اس سرگرمی اور اس اہتمام و انتظام کے باوجود اب آیئے یہ دیکھئے کہ اس ابتلاء سے متعلق، اور خود اپنی ذات سے متعلق ان کے احساسات کیا تھے؟ ان کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ راتوں کی تنہائی میں جب ذرا فرصت ملتی تو رو رو کر اپنی داڑھی تر کر لیتے اور توبہ و استغفار کے ساتھ اپنے رب سے یہ دعا کرتے کہ "اے پروردگار، اُمتِ محمد میرے ہاتھوں تباہ نہ ہو"۔ اللہ اکبر! اس تدبر، اس انتظام اور اس طرح جان لڑا دینے کے بعد بھی تواضع، خشیت اور مقصورِ خدمت کے احساس کا یہ عالم تھا کہ ڈرتے تھے اور روتے تھے کہ کہیں یہ ابتلاء میری اپنی ہی کوتاہیوں کا نتیجہ نہ ہو۔

اس تمام گذارش سے ہمارا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مشرقی پاکستان میں یہ جو کچھ پیش آیا ہے۔ یہ اتفاقی حوادث نہیں ہیں۔ اس دنیا میں کوئی چھوٹا سے چھوٹا واقعہ بھی اتفاق سے پیش نہیں آتا چہ جائیکہ یہ قیامتِ صغریٰ جس سے ۳۱ ہزار مربع میل کا رقبہ تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ بلکہ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لئے ایک بہت بڑی تنبیہہ ہے تاکہ ہم اس خدا کی طرف رجوع کریں جس نے اپنے فضل سے ہمیں ایک خطۂ زمین بخشا کہ ہم اس میں اس کی شریعت نافذ کریں لیکن ہم بدستور خدا اور اس کے دین کے ساتھ مذاق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس تنبیہہ کے مخاطب صرف مشرقی پاکستان کے مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے زیادہ ہم مغربی پاکستان کے مسلمان ہیں اس لئے کہ ہماری غفلتیں شائد ان سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہم نے اس تنبیہہ سے صحیح سبق حاصل نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ہم ان سے بھی زیادہ کسی سخت ابتلاء میں ڈالے جائیں۔ پھر اس تنبیہہ کے مخاطب صرف عوام ہی نہیں ہیں بلکہ اس قوم کے خواص و اکابر اور زعماء و علماء اور ارباب اقتدار عوام سے بھی زیادہ ہیں اس لئے کہ جن خرابیوں کے نتیجہ میں اس طرح کے حوادث ظہور پذیر ہوتے ہیں ان کی اصلاح کی اصلی ذمہ داری چھوٹوں سے زیادہ بڑوں پر ہوتی ہے۔

اس قسم کے طوفانوں کا سدِ باب محکمہ موسمیات کی پیشینگوئیوں، حفاظتی بندوں اور سائنس کی پیش بندیوں، فوج اور پولیس کی کارفرمائیوں اور روس و امریکہ کی رہنمائیوں سے نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی سائنس اللہ کے مقابل میں کھڑی نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی تدبیر اس کی پکڑ سے بچا سکتی۔

یہ سب کیجئے اور زیادہ سے زیادہ کیجئے۔ اس لئے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اس میں اسباب سے گریز ممکن نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی اسباب کی تا بہ حدِ مقدور فراہمی کی ہدایت فرمائی ہے لیکن اس غلط فہمی میں کبھی نہ پڑیئے کہ اسباب کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار خدا کے مقابل میں بھی کام آ سکتی ہے خدا سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو صرف سچی توبہ ہی بچا سکتی ہے۔ وہ توبہ جس کے ساتھ اصلاحِ حال کا سچا اور پکا ارادہ ہو اور چونکہ یہ حوادث ہمارے اجتماعی فسادِ حال کی علامت ہیں اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم من حیث القوم اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں ہی قسم کی نافرمانیوں کی معافی مانگیں اور آئندہ سے اس راستہ پر چلنے کا عزم کریں جو خدا نے بتایا ہے۔

مغربی پاکستان اگرچہ اس قسم کے کسی طوفان سے محفوظ رہا لیکن یہاں شیعوں اور سنیوں میں محرم کے موقع پر جو فسادات ہوئے ہیں ان سے ایک صاحبِ فہم کے لئے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں رہا ہے کہ اگر ہمارے اربابِ حل و عقد فساد کے حقیقی اسباب کا پتہ لگانے میں ناکام رہے اور صرف اُوپر کی لیپ پوت یا صرف فوج اور پولیس کے ذریعہ سے انہوں نے آئندہ کے خطرات کے سدِباب کی اُمید باندھ لی تو یہ ایک ایسی غلطی ہوگی جس کی تلافی پھر کسی بھی دوسرے طریقہ سے نہ ہو سکے گی۔ یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ان فسادات کے اسباب نہ تو سرسری ہیں، نہ وقتی، نہ محدود، بلکہ ان کے اثرات بہت دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہ کافی زوردار ہیں۔ اس وجہ سے حکومت کا فرض ہے کہ حالات کے مزید پیچیدہ ہونے سے پہلے پہلے اس معاملہ میں نہایت حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرے اور وقتی سکون سے کسی غلط فہمی میں پڑے بغیر صورتِ حال کا وہ علاج اختیار کرے جو اس کا مستقل اور پائیدار علاج ہے۔

اگر فسادات کی مذمت اور رواداری کی مدح و منقبت سے صورتِ حال کی اصلاح کی کوئی اُمید ہوتی تو ہم بھی اس خدمت کو بڑے شوق سے انجام دیتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اب معاملہ لفظی مدح و ذم کے حدود سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اور حکومت کی تدبیر و تدبر کا محتاج

ہے اس وجہ سے ہم حکومت ہی سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے اور اس کو ادا کرے۔ جہاں تک رواداری کے مبہم وعظ کا تعلق ہے وہ اگر ہم کہیں بھی تو ہم نہیں جانتے کہ اس سے کس کو فائدہ پہنچے گا۔ ہماری آواز اگر کچھ پہنچ سکتی ہے تو سنیوں ہی تک پہنچ سکتی ہے اور وہ شاید ہمارے اس وعظ کے محتاج نہیں ہیں۔ جہاں تک اہل بیتؓ کی عقیدت و محبت کا تعلق ہے یہ چیز ان کے ایمان وعقیدے کا جزو ہے، اس کو بتانے اور سکھانے کی انکو ضرورت نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں تو وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی اس کے شرعی حدود سے آگے بڑھ کر بدعت اور غلو کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ آج تعزیوں کے جلوسوں اور عزا کی مجالس کی رونق بڑھانے میں سنیوں کے عوام تو درکنار اُن کے علما تک حصہ لیتے ہیں، اور دانستہ یا نادانستہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ تبرا کے بھی مرتکب ہوتے ہیں جنہوں نے حضرت حسین کا ساتھ نہیں دیا . . . . . پڑھے لکھے بلکہ علم دین کے دعویدار سنیوں تک کا حال یہ ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کو بے تکلف امام حسین علیہ السلام لکھتے اور کہتے ہیں حالانکہ حضرت حسینؓ کے لئے امام کا لقب خالص شیعی تصور کا حامل ہے جس کے جواز کی اہل سنت کے ہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح علیہ السلام کا لفظ بھی صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہے لیکن سُنی حضرات اس کو بے تکلف حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے لئے لکھتے اور بولتے ہیں۔ تاریخ کے معاملہ میں بھی اہل سنت کے بہت سے علماء تک پر محض اہل بیت کی عقیدت کے تحت شیعی نقطہ نظر اس قدر غالب ہے کہ جن حقیقت شناسوں نے ان کی اس غلطی کی اصلاح کی کوشش کی ان پر ان سنی حضرات ہی نے فوراً ناصبیت کا فتویٰ جڑ دیا ——

ایسے حالات میں سنیوں کے سامنے اگر ہم رواداری کا مزید وعظ کہیں تو یہ چیز تحصیل حاصل ہی ہوگی رہا شیعہ حضرات کا معاملہ تو ان سے ہم کچھ کہنے کے پوزیشن میں نہیں ہیں البتہ حکومت کے سامنے یہ ظاہر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سنیوں کے جذبات حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور دوسرے صحابہ و صحابیات اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم اجمعین کے معاملہ میں حد درجہ نازک ہیں، وہ ان بزرگوں کو مسلم طور پر اپنے لئے نمونہ ہدایت اور ان کی محبت کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ بالخصوص حضرات شیخین رضی اللہ عنہما تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملت اسلامیہ کے دو ایسے ستون ہیں جن کے اوپر ہمارے نزدیک بنائے ملت قائم ہے۔

(باقی بر صفحہ ۵۴ پر دیکھیں)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۳۱)

إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْءِ .... مَا لَا تَعْلَمُوْنَ | "امر" کے معنی جس طرح کسی بات کا حکم دینے کے ہیں اسی طرح کوئی بات سمجھانے یا اس کا مشورہ دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً

امرتهم امری بمنعرج اللوی　　فلم یستبینوا الرشد الا ضحی الغد

"میں نے اُن کو اپنے مشورہ سے منعرج اللوی ہی میں آگاہ کر دیا تھا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں دوسرے دن کی صبح سے پہلے نہ آسکی۔"

یا

اطعت الآمریك بصرم حبلی

"تو نے بالآخر انہی لوگوں کی بات سنی جو تجھے مجھ سے قطع تعلق کا مشورہ دینے والے تھے۔"

"سوء" کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے جسمانی اور مادی نقصان اور گزند بھی مراد ہوتا ہے۔ مثلاً فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْءٌ ۱۷۳ - آل عمران (اور وُہ خدا کی نعمت اور اس کا فضل لے کر لوٹے اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا) اس سے بیماری بھی مراد ہوتی ہے مثلاً وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۱۲ - نمل (اور تم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرو، وہ اس کے اندر سے سفید برآمد ہوگا بغیر کسی

مرض کے) اسی طرح یہ بدی اور گناہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، عام اس سے کہ بدی چھوٹی ہو یا بڑی مثلاً اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ ۱۷۔ نساء (اللہ کے ذمہ ان لوگوں کی توبہ کی قبولیت ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھیں پھر فوراً توبہ کرلیں)

فحشاء کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے کی قسم کی برائیوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں جب سوء اور فحشاء دونوں لفظ ایک ساتھ جمع ہوجاتے ہیں تو یہ نہ صرف تمام چھوٹی بڑی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کے مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات بھی ان کے تحت آجاتے ہیں۔

قول علی اللہ اور افتراء علی اللہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی خدا کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا ساجھی اور شریک قرار دیا ہے یا بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے فلاں فلاں قسم کی چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔

شیطان کے امر کرنے سے یہاں مطلب اس کا ان باتوں کے لئے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنا اور نگاہوں میں لگھانا ہے اور شیطان کے مفہوم میں اس کی ساری ذریت شامل ہے، عام اس سے کہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ یہی مضمون ایک دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱۔ انعام (اور وہ چیزیں نہ کھاؤ جن پر خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے، بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں۔ اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم مشرکوں میں سے ہوجاؤ گے)

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ رحمان اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی و فطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو ان کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آسکتا۔ اوپر والی آیت میں گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لئے جائز ٹھہرائی ہیں وہ اپنے اثرات، اپنے ظاہر اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوشگوار، معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں اس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ سب کی سب

روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اس واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی اختیار کریں ان کی شامت ہی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا .... لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ | یعنی ان تمام مشرکانہ رسوم کے معاملہ میں ان کا اعتماد کسی دلیل اور سند پر نہیں بلکہ محض پچھلوں کی تقلید اور ان کی بے سند روایات کی پیروی پر ہے اور جب ان کو اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ ان بے سند باتوں کی جگہ اس کتاب کی پیروی کرو جو خدا کی اصل شریعت سے آگاہ کرنے کے لئے تم پر نازل کی جارہی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بدستور اپنے باپ دادا کے طریقہ پر جمے رہیں گے۔ اس پر قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا باپ دادا کے طریقہ کی پیروی پر ان کا یہ جمود اور اصرار اس شکل میں بھی معقول قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ یہ واضح ہو کہ ان کے باپ دادا نے نہ تو ان معاملات میں عقل کی رہنمائی پر اعتماد کیا ہے نہ خدا کی تعلیم پر بلکہ یا تو بے سمجھے بوجھے محض لکیر پیٹتے رہے ہیں یا اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی ہیں؟

قرآن کے اس سوال کے انداز سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجرد یہ چیز کہ ایک بات باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر اس کو رکھ کر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بات اگر مجرد عقل و رائے سے تعلق رکھنے والی ہے تو وہ عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں اور اگر دین سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس کی کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد سند ہے یا نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قرآن ایک طرف تو مجرد تقلید پر اعتماد کرنے کے بجائے تحقیق اور تنقید کے لئے برابر آنکھیں کھولے رکھنے کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف وہ ماضی کے ورثہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھنے کی بھی ہدایت کرتا ہے اور بغیر تحقیق و تنقید اس سے دستبردار ہوجانے کی اجازت نہیں دیتا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ .... فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ | نعق نعیق کے معنی چیخنے اور آواز دینے کے آتے ہیں۔ نعق المؤذن کے معنی ہیں مؤذن نے اذان دی۔ نعق الراعی بغنمہ کے معنی ہیں چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا یا پکارا۔

یہ ایک تمثیل ہے جس میں ایک صورت حال کی دوسری صورت حال سے تمثیل دی گئی ہے۔

اس طرح کی تمثیلات میں، جیسا کہ ہم آیات ۱۷ – ۱۸ کی تمثیلات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، مُمَثّل اور مُمَثّل بہ کے تمام اجزاء کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی بلکہ صرف صورت واقعہ کی صورت واقعہ سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جس چیز کی تمثیل دی جارہی ہے اس کی پُوری صورت واضح کی جائے بلکہ صرف اس صورت واقعہ کی وضاحت ضروری ہوتی ہے جس سے تمثیل دی جاتی ہے۔ اُسی کے آئینہ میں اس کا عکس بھی دیکھ لیتے ہیں جس کی تمثیل پیش کرنی مقصود ہے۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر اڑ گئے ہیں، ان کی تشبیہ بھیڑوں بکریوں کے گلّے سے دی گئی ہے جو عقل و ادراک سے بالکل عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتا ہے، چرواہے کی آواز بے شک اس کے کانوں سے جا ٹکراتی ہے لیکن اس سے آگے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ چرواہا کس کام کے لئے پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اس تمثیل کے بعد فرمایا کہ "یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں"، جس سے مقصود اس امر کی وضاحت ہے کہ یہ تمثیل تمام عقلی اور روحانی تقاضوں سے اُن کی محرومی کی تمثیل ہے۔ اسی اسلوب کی بعض بلاغتیں آیت ۱۸ کے تحت بھی گذر چکی ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ...... إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ — یہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر یہ مشرکین اپنی مشرکانہ بدعات پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم ان ناروا پابندیوں کو اُٹھا کر ان تمام پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں۔ پھر فرمایا اگر تم اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو اسی کے شکر گزار ہو۔ اس کے بخشے ہوئے رزق اور اس کے پیدا کئے ہوئے چوپایوں کو کسی اور کی نسبت سے حرام ٹھہرانا خدا کی بندگی کے بھی منافی ہے اور اسی کی شکر گذاری کے بھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر مخاطب کر کے یہ بات کہنے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ کھانے پینے کا معاملہ، بالخصوص جب کہ ایسی چیزوں کے کھانے کا معاملہ ہو جن کو پرانے زمانہ سے مذہبی تقدس کی بنیاد پر حرمت کا درجہ حاصل رہا ہو، ایک نازک معاملہ تھا، اس طرح کے معاملات میں انسان کچھ شکّی اور وہمی سا بن جاتا ہے۔ روایت کے خلاف کسی چیز کے کھانے سے طبیعت میں نہ صرف

یہ کہ ایک قسم کی جھجک پیدا ہوتی ہے بلکہ بعض لوگ اس کو تقوی اور دینداری کے بھی خلاف سمجھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ حالت کچھ مسلمانوں کو بھی پیش آئی اس وجہ سے قرآن نے ان کو یہ تنبیہ کی کہ یہ چیز خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی کے منافی ہے۔

سورۂ انعام کے بعض مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو جب قرآن نے مباح کر دیا کہ اللہ کے نام پہ ذبح ہونے کی صورت میں تم ان کو شوق سے کھاؤ تو مشرکین نے یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے جو باپ دادا کے زمانوں سے حرام چلی آرہی تھیں، چونکہ اس طرح کے معاملات میں طبیعتیں، جیسا کہ اوپر گذرا، بڑی حساس ہو جاتی ہیں اس وجہ سے کچھ مسلمانوں پر اس پروپگنڈے کا اثر پڑا۔ سورۂ انعام کی آیات ذیل میں اسی پروپگنڈے کا رد ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ۝ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ۝ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۝ وَإِنْ

پس جن پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو ان کو بے جھجک کھاؤ، اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور آخر تم ان چیزوں کو کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جبکہ وہ چیزیں تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کی جاچکی ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں الا آنکہ تم ان میں سے بھی کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ۔ بہت سے لوگ اپنی من گھڑت باتوں کی آڑ لے کر بغیر کسی علم کے لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کو۔ گناہ ظاہر اور گناہ باطن دونوں سے باز آؤ جو لوگ گناہ کی کمائی کر رہے ہیں وہ اپنی کمائی کا عنقریب بدلہ پائیں گے۔ ہاں ان چیزوں میں سے نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ

اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ ۝ لیا گیا ہو، یہ خدا کی نافرمانی ہے۔ اور یہ شیاطین ہیں
(۱۱۸ - ۱۲۱ - انعام) جو اپنے دوستوں کو القا کر رہے ہیں تاکہ وہ تمہارے
ساتھ بحثیں اُٹھائیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث بھی بالکل اسی موقع و محل میں اور مسلمانوں کے سامنے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ .... غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ یہ اشارہ ہے ان چیزوں کی طرف جو اصلاً ملت ابراہیم علیہ السّلام میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں اور مقصود اس سے ہرگز ہرگز حرام و حلال کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مشرکین کی تردید ہے کہ انہوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، ملت ابراہیم علیہ السّلام میں صرف یہ یہ چیزیں حرام تھیں۔ بالکل اسی سیاق میں یہی بات سورۂ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِىۡ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَىَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطۡعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ مَيۡتَةً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِيۡرٍ فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ ۱۴۵۔ (کہہ دو کہ مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لئے میں بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت، یہ چیزیں ناپاک ہیں۔ یا پھر خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے۔)

"قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِيۡمَاۤ اُوۡحِىَ اِلَىَّ" کے الفاظ پر ان کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مشرکین کے سامنے اس بات کی وضاحت کرائی جا رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیم علیہ السّلام کی طرف نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، مجھ پر ملتِ ابراہیم علیہ السّلام کے ضابطۂ حلت و حرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ فلاں فلاں چیزوں کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ٹھہرائی گئی۔

بعض لوگ زیر بحث آیت کو اس کے موقع و محل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ

کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لئے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں 'میتۃ' کا جو لفظ آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں۔ پھر مزید بعض دوسری چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ان بیان کردہ چیزوں میں سے مردار، خون اور لحم خنزیر کی حرمت تو ان کی ظاہری گندگی کے سبب سے ہے اس لئے کہ اسلام میں صرف پاکیزہ چیزیں ہی جیسا کہ اُوپر اشارہ گذرا، حلال ٹھہرائی گئی ہیں، جو چیزیں دیکھنے ہی سے گندی اور نجس محسوس ہوتی ہیں ان کو اس دین فطرت میں حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ رہی غیر اللہ کے ذبیحہ کی حرمت تو اس کی حرمت کی وجہ اس کی باطنی گندگی ہے۔ یہ حقیقت اسلام میں اپنی جگہ پر بالکل مسلّم اور واضح ہے کہ شرک سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے اس وجہ سے اگر کسی پہلو سے اس کی چھوت کسی پاک چیز کو بھی لگ جاتی ہے تو وہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ان دونوں قسموں کی نجاستوں کی طرف اشارہ خود قرآن ہی نے کر دیا ہے۔ چنانچہ انعام ۱۴۵ میں مردار، خون اور لحم خنزیر کے ذکر کے بعد فرمایا کہ 'فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ' یہ چیزیں اس وجہ سے حرام ہیں کہ یہ نجس ہیں اور غیر اللہ کے ذبیحہ کا ذکر اَوۡ فِسۡقًا اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ کے الفاظ کے ساتھ کیا جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کی نجاست ظاہری نہیں بلکہ عقلی اور عقائدی ہے۔ پھر سورۂ انعام میں انہی مسائل کے بیان کے سلسلہ میں دین کی یہ ایک بہت بڑی حقیقت بھی واضح کر دی کہ اسلام کا مطالبہ اپنے ہر پیرو سے صرف گناہ ظاہری کے چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ گناہ باطنی کے چھوڑنے کے لئے بھی ہے اس وجہ سے ظاہری گندگی سے آلودہ چیزوں کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی گندگی سے ملوث چیزوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ (انعام) اسی ضابطہ کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا۔" اضطر "ضرر" سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق 'ض' کی مناسبت سے افتعال کی 'ت'، 'ط' سے بدل گئی ہے۔ ضرہ الی کذا کے معنی ہیں الجاءہ الیہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنی ہیں احوجہ والجاءہ اس کو فلاں چیز پر مجبور کر دیا۔ بغیٰ یبغی کے معنی یہاں چاہنے اور

طلب کرنے کے ہیں۔ 'غیر باغ ولا عاد' یہاں حال پڑے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ 'اضطرار' کے ساتھ مخمصہ کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی جان بچانے کے لئے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو۔ نہ تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھنے والا ہو جس حد تک بڑھنا جان بچانے کے لئے ناگزیر ہو۔ ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اُٹھائے تو فرمایا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ غفور رحیم ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اس حالت اضطرار کے لئے ایک رخصت ہے جو غذا میسر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اسی پر قیاس کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص حالت اکراہ میں مبتلا ہو جائے وہ بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن بعض فقہا نے اس حد سے بڑھ کر اس کو عزیمت کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک تو وہ شخص خودکشی کا مجرم ٹھہرے گا جو اس طرح کے حالات میں حرام سے فائدہ اُٹھانے کی جگہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے گا۔ ہمارے نزدیک اس اجمال کے ساتھ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک تفصیل بھی ہے جس کے سامنے آئے بغیر اس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم آگے مستقل عنوان سے یہ تفصیل پیش کریں گے تاکہ رخصت و عزیمت کے معاملہ میں اسلام کا جو مزاج ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ ...... وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ | یہ اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جس طرح مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض چیزیں حرام ٹھہرا لی تھیں اور اسلام کی طرف سے ان کی تحلیل کو خلاف تقویٰ و طہارت قرار دیتے تھے اسی طرح اہل کتاب نے بھی اپنے بہت سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے لیا تھا اور اب جبکہ اسلام حرام و حلال کے معاملہ میں اس ضابطہ کی طرف لوگوں کو لوٹا رہا تھا جو توہمات و بدعات کے بجائے ملت ابراہیم (علیہ السلام) کی اساس اور وحی الٰہی کی رہنمائی پر مبنی تھا تو یہ لوگ اس کی تائید کرنے کی جگہ کتاب الٰہی کی باتوں کو چھپاتے تھے۔

اس طرح کی ایک سے زیادہ چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہود اُونٹ کے متعلق دعویٰ کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حرام ہے حالانکہ تورات میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا چنانچہ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِيْنَ ، فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۹۳-۹۴- آل عمران (ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو تورات لا کر پیش کرو۔ جو اس کے بعد بھی خدا پر جھوٹ باندھیں تو وہی لوگ اصلی ظالم ہیں)

اسی طرح بعض چیزیں یہود پر ان کی سرکشی اور کٹ حجتی کے سبب سے یا ان کے سوال در سوال کی بیماری کے باعث حرام ہو گئی تھیں لیکن اس طرح کی حرمتوں سے متعلق ان کو یہ آگاہی دے دی گئی تھی کہ جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو وہ تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزوں کو حلال کر دیں گے اور جو قیدیں اور بندشیں تم پر آج عائد ہیں یہ سب دُور ہو جائیں گی لیکن یہود نے اس معاملہ میں بھی حق پوشی اور کفرانِ نعمت کی وہی روش اختیار کی جو ابتدا سے ان کی روش تھی۔ انہوں نے ان چیزوں کی تحلیل کو آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا احسان قرار دینے کے بجائے اس کو دینداری اور تقویٰ کے خلاف قرار دیا اور اس کی آڑ میں، قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب مخالفت کی۔

اس باب میں بعض جرائم نصاریٰ کے بھی بڑے شدید ہیں۔ اگرچہ ان کا جرم تحریم سے زیادہ تحلیل کی نوعیت کا ہے۔ پال نے جو موجودہ مسیحیت کا بانی ہے یہ فلسفہ پیش کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے احکام غیر بنی اسرائیل پر واجب نہیں ہیں اسی طرح اس نے مسیحیوں کے لئے شراب بھی کھلے بندوں جائز کر دی اور خنزیر اور گلا گھونٹے ہوئے جانور کو بھی ان کے لئے مباح کر دیا۔

ان اہل کتاب کے متعلق قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ جو حق پوشی کر رہے ہیں اور اپنی دُنیا بنانے کی خاطر دین کو جو بیچ رہے ہیں یہ سودا ان کو بڑا مہنگا پڑے گا۔ دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے، یہ آگ ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اور اب قیامت کے دن نہ تو خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، اب ان کے لئے اذیت ناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

بات نہ کرنے کا مطلب ظاہر ہے کہ لطف و عنایت کی بات نہ کرنا ہے۔ گویا فعل کی نفی سے مقصود فعل کی نفی ہے۔ دوسری جگہ اس سلسلہ میں وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ کے الفاظ بھی ہیں اس سے بھی مراد نگاہ التفات کی نفی ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خدا جس قوم کو کتاب و شریعت

دیتا ہے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لئے اس کے اندر اپنا نبی بھیجتا ہے تو یہ بھی نبی کے واسطے سے خداوند تعالیٰ گویا اس قوم کو اپنے شرف تکلم سے نوازتا ہے۔ پھر خاص طور پر بنی اسرائیل کو تو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پیغمبر کو اپنے خطاب کے شرف سے نوازا۔ اس عظیم عزت افزائی کا تقاضا یہ تھا کہ یہود دل و جان سے خدا کی شریعت اور اس کے کلام کی قدر کرتے اور گوشے گوشے میں اس کا چرچا پھیلاتے لیکن جب انہوں نے اس کو شرف سمجھ کر اس کو پھیلانے کی جگہ اس کو عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی تو اب ان کا کیا منہ رہ گیا ہے کہ خدا ان کو قیامت کے دن پھر اپنے شرفِ خطاب سے نوازے۔

" اور نہ ان کو پاک کرے گا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور کتاب کی نعمت سے اسی لئے نوازا تھا کہ ان کو پاکیزہ بنائے لیکن جب انہوں نے اس نعمت کے باوجود گمراہیوں اور آلودگیوں ہی میں لتھڑے رہنا پسند کیا تو اب خدا ان کو آخرت میں پاک نہیں کرے گا۔ آخرت میں پاک نہ کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت تزکیہ و تطہیر کا محل نہیں ہے بلکہ جزا و سزا کا محل ہے اس وجہ سے وہاں کسی کے تزکیہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی ان بداعمالیوں کے سبب سے چونکہ ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے اس وجہ سے ان کو یہ موقع بھی نہیں حاصل ہوگا کہ یہ دوزخ میں اپنے اعمال کی سزا بھگت کر اور پاکیزہ ہو کر جنت میں جا سکیں۔ بلکہ ان کے لئے دائمی عذاب ہوگا اور یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلم شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے زانی، جھوٹے بادشاہ اور گدائے متکبر کو بھی داخل کیا ہے۔ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ اشتراک علت کی وجہ سے آیت کے حکم کی توسیع ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ ...... فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ | فَمَا أَصْبَرَ، کا اسلوب ما احسن کی طرح اظہار تعجب کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس دیدہ دلیری کے ساتھ ہدایت کی جگہ ضلالت اور مغفرت کی جگہ عذاب کو ترجیح دے رہے ہیں تو دوزخ کے معاملہ میں ان کی ڈھٹائی اور جرأت حیرت انگیز ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ...... لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ | یہ اس ناراضگی اور غضب کا سبب بیان ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب کے

مستحق اس وجہ سے ٹھہریں گے کہ خدا نے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے ایک ایسی کتاب اتاری جو تمام جھگڑوں اور سارے اختلافات کو چکا دینے والی ہے لیکن انہوں نے اس کے بعد بھی ہدایت کی جگہ ضلالت ہی کو اختیار کیا تو یہ اسی بات کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے خدا کی نظر التفات سے محروم ہو کر اس عذاب میں پڑیں جس سے ان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو۔

اس میں " بالحق[1]" کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ خدا نے یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اُتاری ہے۔ یعنی اہل کتاب نے حق پوشی تحریف کر کے اللہ کے دین میں جو طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیئے تھے اور جس کے سبب سے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا کہ کیا حرام ہے، کیا حلال اور کیا حق ہے اور کیا باطل؛ اللہ نے قرآن کے ذریعہ سے اس اختلاف و نزاع کو بالکل رفع کر دیا، اب حق کی راہ ہر طالب حق کے لئے پھر کھل گئی ہے اور خدا کی شریعت اپنی صحیح اور مکمل شکل میں لوگوں کے سامنے آگئی ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ انہی جھگڑوں میں پڑے رہیں تو ان کی شامت اور بدبختی ہی ہے۔

شقاق کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے يَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَن يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ الآیۃ ۸۹۔ ہود (اے میری قوم کے لوگو، میری مخالفت اور دشمنی تمہارے لئے اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تمہارے اوپر بھی اسی طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قوم نوح پر آیا) شقاق کے ساتھ جب بعید کی صفت لگ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی شخص یا چیز کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی شخص اس قدر آگے بڑھ جائے اور اتنی دُور نکل جائے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ ہوش نہ رہ جائے، اور نہ پھر اس کے لئے اتنی دور سے پلٹنے اور تلافی مافات کرنے کا کوئی امکان ہی باقی رہے۔ ان اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ تورات کے بعد اب قرآن میں بھی انہوں نے یہ جو اختلاف کیا ہے یہ محض ان کی ضد م ضدا کا کرشمہ ہے اور یہ اب اس راہ میں اتنی دُور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے واپس لوٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

۵۷۔ رخصت اور عزیمت کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر

آیت ۱۷۳۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ کی وضاحت کے ضمن میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اس شخص کے لئے کسی حرام سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا لینے کی رخصت ہے

[1] لفظ حق کے مختلف معانی کی تحقیق آیت ۷۱ کے تحت ملاحظہ ہو۔ یہاں مراد قول فیصل

جس کی بھوک کے سبب سے جان پر آبنی ہو اور زندگی بچانے کی کوئی اور صورت حرام کھا لینے کے سوا اس کو نظر نہ آرہی ہو۔ قرآن کے الفاظ فلا اثم علیہ (ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں) اور ان اللہ غفور رحیم (اللہ ایسی حالت میں بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے) صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مجبوری کے حالات کے لئے ایک رخصت ہے۔ اسی وجہ سے ہم ان فقہا کی رائے کے بارے میں متردد ہیں جو اس رخصت کو عزیمت کا درجہ دیتے ہیں اور اس شخص پر خودکشی کا حکم لگاتے ہیں جو اضطرار کی حالت میں حرام سے فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے نتیجہ میں اس کی جان چلی جائے۔

ہمارے نزدیک یہ بات اس اجمال کے ساتھ، جیسا کہ ہم آیت کی تاویل کرتے ہوئے ظاہر کر چکے ہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتی رخصت بہرحال رخصت ہے۔ کسی رخصت کو مطلق طور پر عزیمت کا درجہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایک شخص اضطرار کے باوجود حرام سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی موت حرام کی موت ہوئی۔

اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو رخصتیں رکھی ہیں وہ سب اس کی مہربانی اور رحمت کا مظہر ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں اور ہماری مجبوریوں سے سب سے زیادہ باخبر ہے اس وجہ سے اس نے ہم پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالا ہے جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اس نے وضو کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر سفر کی حالت ہو، پانی نہ دستیاب ہو سکتا ہو یا بیماری کے سبب سے وضو کرنے میں مضرت کا اندیشہ ہو تو آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ اس نے نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ رخصت بھی عنایت فرمائی کہ سفر کی حالت میں آدمی قصر کر سکتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دیا تو یہ اجازت بھی دی کہ اگر روزے کے مہینہ میں سفر پیش آجائے یا آدمی بیمار پڑ جائے تو دوسرے دنوں میں اپنے روزے پورے کرے۔ اس طرح کی رخصتیں دین کے اُن تمام احکام کے ساتھ مذکور ہیں جن کی تعمیل کے کسی مرحلہ میں کوئی ایسی مشکل پیش آسکتی ہے جو عام توت برداشت سے زیادہ ہو۔ ان کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت پیش آجانے پر ان سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں خواہ مخواہ اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص مضرت کے اندیشہ کے باوجود تیمم کے بجائے وضو پر اصرار کرے یا رخصتوں کے باوجود سفر میں اتمام نماز ہی کو

تقاضائے تقویٰ سمجھے یا مشقت کے باوجود سفر کی حالت میں بھی روزے پورے کرنے کو عزیمت جانے تو ہمارے نزدیک ایسا شخص اسلام کا اصلی مزاج سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ دین کے معاملہ میں تشدد پسندی ہے اور جو شخص دین میں تشدد پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے اور رخصتوں کو خلاف عزیمت جانتا ہے وہ درحقیقت دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے اور ایسا شخص حدیث میں وارد ہے کہ دین سے شکست کھا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تنبیہ فرمائی جو سفر میں روزے کی وجہ سے اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن اگر کسی شخص کو سفر میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں وہ بلا کسی خاص زحمت کے پوری نمازیں پڑھ سکتا ہے یا روزے رکھ سکتا ہے تو اس سے کسی گناہ کے لازم ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو حالت اضطرار پیش آجائے اور جان بچانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے تو عام حالات میں اسلام کا مزاج یہی تقاضا کرتا ہے کہ جان بچانے کی حد تک وہ اس حرام سے فائدہ اٹھائے۔ اس چیز کو خلاف تقویٰ خیال کرے نہ خلاف عزیمت لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جب ایک غیرت مند مسلمان کے شایان شان بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جان تو دیدے لیکن حرام کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کرے مثلاً اگر کسی جگہ فساق و فجار کے صاحب اختیار ہونے کی وجہ سے حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہو اور آدمی کو کوئی حرام چیز کھانے پر مجبور کیا جائے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ عزیمت کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کے لئے اپنی زندگی قربان کر دے۔ یہ بازی کھیل کر وہ گنہگار نہیں ہوگا بلکہ ان شاء اللہ اپنی غیرت ایمانی اور احترام حقوق شریعت الٰہی کے صلہ میں شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ کم از کم علمائے مصلحین کے لئے تو ایسے حالات کے اندر یہی روش بہتر ہے۔ حضرات صحابہؓ نے مکہ کی ابتدائی زندگی میں جو تکلیفیں کلمۂ توحید کی خاطر اٹھائی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں! کتنے اصحاب نے اعدائے توحید کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور زندگی تو سب ہی حضرات کی خطرے میں رہی لیکن ان میں سے کسی ایک صحابیؓ کے متعلق بھی ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ انہوں نے جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے

نکالا ہو حالانکہ قرآن میں اس بات کی صریح اجازت موجود تھی کہ اکراہ کی صورت میں آدمی جان بچانے کے لئے کلمہ کفر کہہ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ نہ تو دین کی رخصتوں کو حقیر سمجھنے کا رجحان صحیح ہے اور نہ رخصتوں ہی کو عزیمت قرار دے دینے کا رجحان صحیح ہے بلکہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عام حالات میں جس طرح رخصتوں سے فائدہ اٹھانا مزاجِ شریعت کے مطابق ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی دین کا مطالبہ ہے۔

۵۸۔ آگے کا سلسلہ کلام آیت ۱۷۷

اوپر والے مجموعہ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، توحید کا بیان تھا۔ اب آگے والی آیت میں اس کے لوازم و ثمرات یعنی ایمان، انفاق، اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ایفائے عہد اور ہر طرح کے حالات میں حق پر استقامت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس طرح ہے کہ خدا کے ساتھ وفاداری کا حق مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لینے سے ادا نہیں ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے۔ چنانچہ اسی مسئلہ پر ان کے ہاں ایک مدت سے معرکہ جدال و قتال گرم ہے، گویا ان کے خیال میں اصل دین یہی ہے۔ بلکہ اس کے لئے فلاں فلاں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس تمہید سے مقصود مسلمانوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ دین محض چند رسوم و ظواہر کا نام نہیں ہے بلکہ وہ زندگی سے نہایت گہرے تعلق رکھنے والے اعمال و اخلاق کا مجموعہ ہے اس وجہ سے وہ اگلی امتوں کی طرح صرف رسوم کے بندے بن کر نہ رہ جائیں بلکہ دین کی اصلی حقیقتوں کو اپنائیں جو یہ ہیں انہی کو اپنا کر وہ خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر سکیں گے۔ ان کے بغیر محبت و وفاداری کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اس روشنی میں آیت کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ "

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر لو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

۵۹۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

"بِرّ" کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو یا اللہ کے بندوں کا حق ہو۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف، ولاء، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بَرّ اور بارّ اس سے صفت کے صیغے ہیں۔ بَرٌّ بِوَالِدِہٖ اس سعادتمند بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ بَرَّ بِالْقَسَمِ کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بَرّ کی صفت استعمال ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے بندوں کے جو حقوق اپنے اوپر لئے ہیں یا جو وعدے ان سے کئے ہیں وہ ان کو ایک ایک کر کے دنیا اور آخرت دونوں جگہ پورے کرنے والا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق و واجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے ہمیں ترجمہ کے لئے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر دے۔ ہم نے جو لفظ

ؔ لفظ بِرّ کی یہ تحقیق زیادہ تر مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔

اختیار کیا ہے وہ ہمارے نزدیک ایک حد تک لفظ کی اصل روح کو ادا کرتا ہے۔

یہاں اصل بیان تو ایمان و انفاق اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس باب کی تمہید میں ہم بیان کر آئے ہیں، ان احکام و شرائع کے پہلو بہ پہلو تجدید دین کے تقاضوں کے تحت ان بدعات کی تردید بھی ہے جو اہلِ کتاب یا مشرکین نے شریعتِ الٰہی میں داخل کر دی تھیں اور جن کے سبب سے پوری شریعت یا تو مسخ ہو کر رہ گئی تھی یا صرف چند ظواہر اور رسوم کا مجموعہ بن گئی تھی۔ یہاں اسی تجدید دین کے تقاضے کے تحت اصل احکام کے بیان کی تمہید اس طرح اٹھائی کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کا حق صرف مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینے سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ اصل شے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے جن کے ہاں تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو طاقِ نسیان پر رکھ دی گئی تھیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کا جھگڑا، جیسا کہ آیات ۱۱۵، ۱۴۲ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، ان کے درمیان اس طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا گویا سارے دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے۔

یہ تمہید جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اس امت کے لئے تنبیہ ہے کہ اسی طرح فروعی باتوں میں الجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہو جانا ورنہ یہود و نصاریٰ ہی کی طرح تم بھی مچھر کو چھاننے والے اور اونٹ کے نگلنے والے بن کر رہ جاؤ گے اور جس طرح ان کا دعوائے خدا پرستی بے معنی ثابت ہوا اسی طرح تمہاری خدا پرستی بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ٹھیک اسی مفہوم کی تنبیہ آگے کے بیان کے سلسلہ میں بھی فرمائی ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۱۸۹ - بقرہ (یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، تقویٰ تو اس کا ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے) ان تمام تنبیہات سے مقصود جیسا کہ عرض کیا گیا، اس امت کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی بدعات اور ظاہر پرستیوں سے بچا کر دین کی اصل حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ امت بھی انہیں وادیوں میں بھٹک کر رہ گئی جن میں پچھلی امتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ۔ میں ایک مضاف عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے گویا پوری عبارت یوں ہوگی۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ۔ مضاف کے حذف کی مثال خود اسی زیر بحث آیت میں موجود ہے۔ فرمایا ہے۔ وَفِي الرِّقَابِ۔ ظاہر ہے کہ یہ وَفِي فَكِّ الرِّقَابِ

ہے۔ ایمان سے یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ حقیقی ایمان مراد ہے۔ اس لئے کہ حقیقی ایمان ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی خدا کی وفاداری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ حقیقی ایمان اللہ پر یہ ہے کہ آدمی بلا کسی شائبۂ شرک کے اپنے کو پورا پورا اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ آخرت پر حقیقی ایمان یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر قول و فعل کا خدا کے سامنے جواب دہ سمجھے اور جھوٹی شفاعتوں کے وہم میں مبتلا نہ ہو۔ فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہستی کو تسلیم کرے، ان کو معصوم اور قدسی صفت جانے، ان کو اللہ کی ہدایت لانے والا امین اور معتمد مانے اور ان کو قضا و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ سمجھے۔ ایمان بالکتاب کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت مانے، اس کو حق و باطل کی کسوٹی سمجھے اور زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کرے۔ نبیوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لئے اسوہ قرار دے اور ان کی اطاعت، اتباع اور محبت کو لازم جانے۔

یہاں ایک بات ممکن ہے بعض ذہنوں میں کچھ کھٹکے۔ وہ یہ کہ ایمان کے اجزاء میں فرشتوں پر ایمان کو کیوں داخل کر دیا ہے جب کہ ان کا تجربہ صرف نبیوں ہی کو ہوا ہے اور ان پر ایمان لانے کا کوئی خاص علمی یا عملی فائدہ ایک عام آدمی پر واضح نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کا حق آخرت، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے بغیر ادا نہیں ہوتا انہی چیزوں پر ایمان لانے سے ایمان باللہ ہماری زندگی کی ایک محسوس، موثر اور فعال حقیقت بنتا ہے اسی طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل کا ایک غیر منفک جزو ایمان بالملائکہ ہے۔ ملائکہ کو مانے بغیر خدا اور اس کے نبیوں کے درمیان کا واسطہ غیر واضح اور غیر معین رہ جاتا ہے جس کے غیر واضح رہنے سے نہ صرف سلسلۂ علم و ہدایت کی ایک نہایت اہم کڑی گم شدہ رہ جاتی ہے بلکہ ہدایت آسمانی کے باب میں عقل انسانی کو گمراہی کی بہت سی راہیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بات تو دنیا ہمیشہ سے مانتی آئی ہے کہ خدا ہے اور یہ بات بھی اس نے ہمیشہ محسوس کی ہے کہ جب وہ ہے تو اسے اپنی مرضیات سے بھی اپنے بندوں کو آگاہ کرنا چاہئے لیکن جب وہ کبھی بے نقاب اور رو در رو ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ذریعہ اور واسطہ کیا ہے جس سے وہ خلق کو اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لئے اس نے اپنے خاص خاص بندوں کو منتخب کیا ہے جن کو انبیاء و رسل کہتے ہیں تو بعینہ

یہی سوال ان کے باب میں بھی اٹھتا ہے کہ وہ ان نبیوں اور رسولوں کو اپنے علم و ہدایت سے آگاہ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ کیا رو در رو ہو کر خود ان سے بات کرتا ہے یا کوئی اور ذریعہ اختیار فرماتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان علم کا واسطہ وحی ہے جو وہ اپنے فرشتوں بالخصوص اپنے مقرب فرشتے جبریلؑ کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ یہ فرشتے خدا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور برتر مخلوق ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ راست خدا سے وحی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ خدا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں اور چونکہ خدا کے حکم و اختیار کے تحت اور اس کی نگرانی میں کرتے ہیں اس وجہ سے نہ تو کوئی اور مخلوق ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈال سکتی اور نہ وہ خود ہی اس میں کسی بھول چوک یا کسی غلطی کے مرتکب ہو سکتے۔ انہی کے زمرہ کی ایک مقرب ہستی حضرت جبریلؑ ہیں جو خدا کے ہاں سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور مقرب ہیں۔ قرآن میں ان کی صفت ذی قوت، مطاع اور امین بھی آئی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کے لئے تمام صلاحیتوں اور قوتوں سے بھرپور ہیں، دوسری قوتیں یا ارواح خبیثہ ان کو متاثر یا مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ان کے دائرہ کار میں سب بے چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکے، وحی الٰہی کی جو امانت نبیوں اور رسولوں تک پہنچانے کے لئے ان کے سپرد کی جاتی ہے وہ اس کو بے کم و کاست پہنچاتے ہیں، ممکن نہیں کہ اس میں کسی زیر زبر کا بھی فرق ہو سکے۔

وحی و رسالت کے ساتھ فرشتوں کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے لئے ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوا۔ یہ خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان رسالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ناگزیر ہیں کہ یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالم لاہوت اور عالم ناسوت دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں، یہ اپنی نورانیت کی وجہ سے خدا کے انوار و تجلیات کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں اور اپنی مخلوقیت کے پہلو سے انسانوں سے بھی اتصال پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور مخلوق خدا تک رسائی کا یہ درجہ اور مقام نہیں رکھتی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے جو خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان رسالت کا واسطہ ہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ عقل انسانی عالم لاہوت سے تعلق رکھنے والی ارواح کے تجسس میں ہمیشہ سے رہی ہے اور اس ضرورت کو اس نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اس کاوش میں اگر اس کو کوئی صحیح چیز نہیں مل سکی ہے تو جو غلط سے غلط چیز بھی اس کے ہاتھ آ گئی ہے اسی کا دامن اس نے پکڑ لیا ہے۔ عرب کے کاہن اور ساحر جنات اور شیاطین اور ہاتف غیبی کو عالم لاہوت سے تعلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، ہندوستان کے جوتشی اور منجم ستاروں کی گردشوں کے اندر غیب کے اسرار ڈھونڈھتے تھے، چین کے مندروں کے پجاری اپنے باپ دادا کی ارواح کے توسط سے عالم غیب سے توسل پیدا کرتے تھے۔ قرآن نے ان تمام غلط وسائل اور واسطوں کی نفی کر دی اور ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ علم کو رطب و یابس کا مجموعہ ٹھہرایا اور ساتھ ہی یہ حقیقت واضح فرمائی کہ علم الٰہی کا قابل اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیاء کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ بے کم و کاست ان کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان بالملٰئکۃ، ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں اور جس طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء ہماری زندگی کی نہایت محسوس حقیقتیں ہیں اسی طرح ایمان بالملٰئکہ بھی ہماری زندگی کی ایک نہایت اہم علمی و عملی حقیقت ہے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ - میں ضمیر مجرور یوں تو خدا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے یعنی آدمی اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں خرچ کرے لیکن ہمارے نزدیک مختلف وجوہ سے ان لوگوں کا قول قابل ترجیح ہے جو اس کا مرجع مال کو قرار دیتے ہیں یعنی آدمی مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ مال کی محبت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود قیمتی اور دل پسند ہو، دوسرا یہ کہ آدمی خود اس کا ایسا ضرورت مند ہو کہ دوسرے کے لئے ایثار کرنا نفس پر شاق ہو رہا ہو۔ تیسرا یہ کہ زمانہ قحط اور گرانی کا ہو جس میں کشادہ دست آدمی بھی محتاط اور کفایت پسند بن جایا کرتا ہے۔ علی حبہ کا لفظ ان تینوں ہی صورتوں پر حاوی ہے۔ اس مفہوم کو ترجیح دینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ

یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بِرّ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفاداری کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو کس قسم کا انفاق کرنا چاہیئے۔ یہ مضمون دوسرے مقامات میں جہاں جہاں بیان ہوا ہے وہاں صراحت کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اس مال کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو محبوب ہو۔ مثلاً۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۹۲ - آل عمران (تم کامل وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک اس مال میں سے خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) اسی طرح دوسرے مقام میں سچے اہل ایمان کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۹ - حشر (اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو)

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کونسا ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔

تیسری یہ کہ اہل عرب کے ہاں بھی سب سے زیادہ قابل تعریف فیاضی انہی لوگوں کی سمجھی جاتی تھی جو زمانۂ قحط و گرانی میں فیاضی کرتے تھے جبکہ مال، مالداروں کی نظر میں بھی بڑی محبوب چیز بن جاتا ہے۔ عرب شعراء نے اس صفت کی بالاتفاق تعریف کی ہے۔ دوسری قوموں میں بھی یہ صفت بلا اختلاف ممدوح ہے۔

چوتھی یہ کہ اس طرح کا انفاق غالب یہی ہے کہ خدا کی محبت میں ہو، اس لئے کہ بغیر اس قوی محرک کے نفس کا اس قسم کے ایثار پر آمادہ ہونا بڑا مشکل ہے۔ اس پہلو سے یہ مفہوم پہلے مفہوم پر خود بخود حاوی ہو جاتا ہے۔

انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابتمندوں کو رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اعزا و اقربا، اگر وہ ضرورت مند ہیں، اس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ دل میں عداوت بھی چھپائے ہوئے ہوں جب بھی سب سے افضل انفاق، جیسا کہ اوپر والی حدیث سے واضح ہوا، وہی ہے جو ان کے لئے کیا جائے۔

قرابتمندوں کے بعد معاً یتامیٰ کا ذکر اسلامی معاشرہ میں ان کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد پہلی نظر آدمی کی ان بچوں پر پڑنی چاہیئے جو سایہ پدری سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کی کفالت و تربیت کی ساری ذمہ داری معاشرہ پر منتقل ہو چکی ہے۔

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافر بجز اپنی مسافرت کی حالت کی بنا پر مستحق اعانت ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ صاحب استطاعت ہے یا غیر صاحب استطاعت۔ اگر مستحق اعانت ہونے کے لئے غیر صاحب استطاعت ہونے کی شرط ہوتی تو مسکین کے بعد اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مسکین کے مفہوم میں یہ آپ سے آپ شامل ہوتا۔

سائلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعانت کے لئے سوال کر بیٹھیں۔ مساکین کے بعد ان کے مستقل ذکر کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص سوال کر بیٹھے اس کے متعلق زیادہ کھوج کرید کی ضرورت نہیں ہے کہ واقعی محتاج ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے ضرورت سوال کر رہا ہے تو اس کی جوابدہی خود اس کے اوپر اللہ کے ہاں ہے۔ ہمارا حق صرف یہ ہے کہ اگر ہم امداد کر سکتے ہوں تو ایسے شخص کی امداد کریں اور اگر معذور ہوں تو جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہدایت ہے شائستہ انداز سے اس کے سامنے اپنی معذرت پیش کر دیں۔

'وفی الرقاب' میں رقاب رقبہ کی جمع ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی فی فک الرقاب۔ گردنوں سے مراد یہاں غلاموں کی گردنیں ہیں جن میں ان کے آقاؤں کی خدمت کے طوق ہوتے تھے۔ ان کو اس طوق غلامی سے چھڑانا اور آزاد انسانوں کی سطح پر لانا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اس وجہ سے اسلام نے اپنی مدات خیر میں ان کو بھی شامل کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا معاملہ اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھا، وقت کے بین الاقوامی قانون جنگ کے تحت اسلام نے اس کو محض وقتی طور پر اس لئے گوارا کیا تھا کہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر جنگ کے قیدیوں کے مسئلہ کا کوئی اور حل موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کو گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے اپنے ماحول میں غلاموں کی آزادی کی مختلف نوعیتوں سے حوصلہ افزائی کی۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کو خرید کر آزاد کر دینے یا ان کی مکاتبت یعنی بشرط آزادی کی رقم ادا کرنے کو ایک ثواب کا کام

ٹھہرا دیا۔

اب اس زمانہ میں غلامی اگرچہ قانوناً ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے لیکن عملاً آج بھی بے شمار انسان اپنی معاشی مجبوریوں اور خاص طور پر سودی قرضوں کی لعنت کے سبب سے ایسے بندھنوں میں گرفتار یا جیلوں میں بند ہیں کہ ان کو اگر غلام نہیں تو غلاموں سے مشابہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی گلو خلاصی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور کھیتوں کو چھڑانا بھی ان شاء اللہ فک رقبۃ ہی کے درجے کی نیکی ہے۔

اقام الصلوۃ واتی الزکوۃ۔ پر مفصل بحث اس کتاب کے شروع میں ہو چکی ہے۔ یہاں ایمان و انفاق کے ذکر کے بعد نماز اور زکوۃ کا ذکر ان دونوں کے قانونی و عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر عملی نماز ہے اور انفاق کی وسیع حقیقت کا مظہر قانونی زکوۃ۔ مطلب ان دونوں کے ذکر سے یہ ہے کہ ایمان اور انفاق کی شہادت دینے کے لئے کم سے کم جو چیز مطلوب ہے وہ نماز اور زکوۃ کا اہتمام ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں غائب ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ایمان باقی رہا نہ انفاق درانحالیکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے بندہ خالق اور خلق کے ساتھ اپنے تعلق کو صحتمندانہ بنیاد پر قایم کرتا ہے۔

یہاں زکوۃ کا علیحدہ ذکر کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ بر و تقویٰ کا درجہ صرف ادائے زکوۃ سے نہیں بلکہ سراً وعلانیۃً فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

'والموفون بعھدھم' (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں) میں دفعۃً اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ اوپر ایمان، انفاق، نماز اور زکوۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا تھا۔ الموفون کا عطف تو انہی پر ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ پھر آگے 'الصابرین فی الباساء' (اور ثابت قدم رہنے والے) آرہا ہے جو ہے تو صفت کی صورت میں لیکن موفون، پر معطوف ہونے کے باوجود صابرون کے بجائے صابرین یعنی حالت نصب میں ہو گیا ہے۔

اسلوب کا یہ رد و بدل صرف تنوع کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معنوی فوائد بھی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

عربی زبان کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ عربی میں فعل کے صیغے تو صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت، کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ سلسلہ کلام میں اگر کسی صفت کا ذکر بغیر کسی ظاہری سبب کے حالت نصب میں ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اس پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے۔ ہمارے اہل نحو اس بات کو 'علی سبیل المدح' یا 'علی سبیل الاختصاص' کی اصطلاح میں تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہاں 'موفون' کے بعد دفعۃً اس سے بالکل مختلف اسلوب میں 'الصابرین' جو آگیا تو اس سے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ گویا متکلم یہ کہنا چاہتا ہے کہ 'انا اخص بالذکر الصابرین' میں صابرین کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

اسلوب کی اس وضاحت کے بعد اب یہ سوال ذہن میں پیدا ہوگا کہ اوپر عقائد اور عبادات کا ذکر تو سیدھے سادھے فعل کے صیغوں سے کیا، پھر یہ ایفائے عہد اور صبر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کا ذکر اسلوب بدل بدل کر اس اہتمام و اختصاص اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ فرمایا؟ اس کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رکھئے۔

ایک تو یہ کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق سیرت و کردار سے ہے۔ سیرت و کردار کا معاملہ بڑے عزم و جزم اور ریاضت و تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری عقائد و عبادات کا تعلق ہے ان کو نبھانے والے تو دین کے زوال و انحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل مذاہب میں یہ کمزوری بہت نمایاں رہی ہے کہ انہوں نے عقائد و عبادات کے ظواہر پر تو بڑے بڑے معرکے اُٹھائے ہیں لیکن کردار کی تعمیر پر انہوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ یہاں چونکہ اس آخری اُمت کی رہنمائی مقام بر و اطاعت کی طرف کی جا رہی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ یہ مقام بغیر اعلیٰ کردار کے جن میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسری یہ کہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام عقائد و عبادات سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت و کردار

کی تعمیر ہی ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصود صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسموں کو بجا لانا ہی تو نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی و اجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے۔ یہ نہ ہو تو تمام عقائد و عبادات سمجھئے کہ بالکل بے جان و بے روح ہیں۔ یہی نکتہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ عقائد و عبادات کے پہلو بہ پہلو ان کے عملی اثرات کی طرف ضرور توجہ دلائی ہے تاکہ ان سے غفلت نہ ہونے پائے۔

تیسری یہ کہ امتحان و آزمائش کا اصلی میدان سیرت و کردار ہی کا میدان ہے۔ انسان کا اصلی خزانہ جو وہ دین کی مدد سے فراہم کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط اور پاکیزہ سیرت ہی ہے۔ یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی مقام بر و تقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے لئے ابرار و صالحین اور شہداء و صدیقین کی معیت کی ضامن بنتی ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس پر خاص طور پر زور دیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کے لئے چوکنا رہے۔

ایک سوال یہاں اور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ یہاں سیرت و کردار سے متعلق صرف دو ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ایفائے عہد کا، دوسری صبر کا۔ اس فہرست میں اور بھی چیزیں شامل ہو سکتی تھیں، آخر ان کا ذکر کیوں نہیں فرمایا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت سیرت و اخلاق سے متعلق تمام اجزا کے لئے بمنزلہ شیرازہ ہیں۔ ایفائے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آ جاتے ہیں خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ ان کا اظہار و اعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے ہوئے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلہ، استاذ اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدہ کے تحت بندھے ہوئے ہیں اور یہ بر و تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ان تمام معاہدوں کے حقوق ادا کرنے

والے بنیں۔ گویا ایفائے عہد کی اصل روح ایفائے حقوق ہے اور ایفائے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔

اس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کر کے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفائے حقوق کی اس راہ میں حائل ہو مومن عزیمت و استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی یا خوف سے مغلوب نہ ہو۔

صبر کے لئے تین مواقع کا حوالہ دیا ہے۔ ایک بَأْسَاء کا جس سے فقر و فاقہ کی تکالیف مراد ہیں۔ دوسرے ضَرَّاء کا جس سے تکالیف جسمانی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے بَأْس کا جس سے جنگ کے حالات مراد ہیں۔ غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ انسان کا عزم انہی تین راہوں سے آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں حالتوں کے اندر موقف حق پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بر و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے وفاداری میں سچے اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں) اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ جو لوگ محض چند خالی خولی ظاہر داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں، نہ متقی ہیں۔

ایک نکتہ یہاں اور بھی ملحوظ رہے وہ یہ کہ 'وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ' کے ساتھ 'إِذَا عَاهَدُوا' کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے بھی اس عزم و استقلال کا اظہار ہو رہا ہے جو ان وفا پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو خواہ کچھ ہی ہو، اس کے سبب سے انہیں کیسے ہی نقصانات و آلام سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے لیکن وہ پیٹھ نہیں دکھاتے بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو پورا کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں جو رویہ رہا ہے وہ پوری تاریخ انسانی میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے خاص کر صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ابو جندل کے معاملہ میں معاہدہ کا جو احترام کیا وہ تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

افاداتِ فراہیؒ

امین احسن اصلاحی

شانِ نزول

شانِ نُزُول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سُورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وُہ حالت وکیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسرِ موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امُور کو مدِّنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو، اور وہ امر یا امور جن کو کسی سوُرہ میں مدنظر رکھا جاتا ہے، اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم کو شانِ نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم ہر سورہ سے اس سورہ کی شانِ نزول معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیشِ نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہو گی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزا، باہمدگر مربوط و متصل ہوں گے۔ اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل درپیش تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ سوُرہ کے نزول کے لئے محرکات اور اسباب موجود تھے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال

ہوتا ہے، اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورۂ انعام میں وَإِذَا جَآءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا - الآیۃ کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے۔ وہاں امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے؟"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا صورت معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے وہ اس غرض کے لئے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح وتشریح ہیں اُن کی توضیح وتشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس وابہام نہ ہو جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات ومقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر گرچہ نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اس کا کلام اُس طرح کے تمام احوال ومعاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے جیسا کہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے چنانچہ فرمایا ہے وَإِن تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ (اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت نزول میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے لوگوں کے سوالوں کے جواب دے دیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سُورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام تقاضے پوُرے ہو جاتے تو وہ سورہ تمام کر دی جاتی اور نا ممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضاء سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔

لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی تو اس وقت دوسری سورۂ نازل کی جاتی۔ شانِ نزول وہی ہوتی لیکن اسلوب میں تبدیلی کر دی جاتی تاکہ یکسانی ویکرنگی سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے بعثت کی بہت سی سورتوں میں حشر ونشر، توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین

ملتے ہیں، صرف اسلوب اور طرزِ بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی اس وقت کوئی آیت اُتر تی اور جہاں ضرورت ہوتی وہ آیت وہیں رکھ دی جاتی۔ یہ امر وعدہ کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورہ قیامہ میں فرمایا ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی توضیح کرنا) ایسے مواقع پر زمانہ نزول کا لحاظ نہ ہوتا بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد تنبیہ بھی کر دی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں ان کے بعد بالعموم آیت آئی ہے۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کو سمجھانے کیلئے کھولتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں)

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں رشتہ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کریں۔ پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ سبب نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہو۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص حالت و صورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت و صورت اس حکم کی حکمت و علت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعدد ازدواج اور وحدت ازدواج دونوں کا حکم ہے اب اگر تم اس شان نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام سے نکلتی ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پہلا حکم یتامیٰ[1] کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور ان دونوں کے درمیان جامع رشتہ قسط بالضعفا یعنی کمزوروں کے ساتھ انصاف ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہوگی جو مقدم ہے۔ یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے۔ کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دنارت کی بات ہے پس ضرورت کیلئے اس کی اجازت دی اور ضرورت رفع ہو جانے کے بعد اس کے لوٹا دینے کا حکم دیا۔

[1] بعض مرتبہ یتیموں کی پرورش یا اس قسم کی کوئی دوسری معاشرتی یا اخلاقی و اجتماعی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھے۔ (مترجم)

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

جمال عبدالنّاصر اور نعرۂ اتحادِ عرب

آپ نے مئی کے پرچہ میں عرب کی سیاسی کشمکش پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے۔ آپ نے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے وہ بہت سے شبہات بالکل صاف ہو گئے ہیں جو جمال عبدالناصر کے خلاف اس وقت عرب اور دوسرے مسلمان ملکوں میں پھیلائے جا رہے ہیں لیکن بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قومیت کا نعرہ اسلام کے خلاف ہے اس وجہ سے یہ نعرہ بلند کر کے جمال عبدالناصر ایک فتنہ کو جگا رہے ہیں جس سے مسلمانوں کے ملی اتحاد کو نقصان پہنچیگا۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ نعرہ اسلام کے خلاف ہے لیکن چونکہ آپ اس کی زد اسلام اور مسلمانوں پر نہیں سمجھتے بلکہ حکومت اسرائیل اور سامراجیوں پر سمجھتے ہیں اس وجہ سے آپ نے جمال عبدالناصر کے موقف کی تائید کی ہے۔ لیکن جو چیز اسلام کے خلاف ہے اور جس سے جاہلی نعروں کو تقویت حاصل ہونے کا اندیشہ ہے کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس کو فروغ پانے کا موقع دیا جائے؟ میں یہ بات بطور اعتراض نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ اپنے ایک شبہ کا ازالہ چاہتا ہوں۔

جواب:- یہ بات صحیح نہیں ہے کہ قومیت کا شعور یا اظہار بجائے خود کوئی کفر ہے جس کے لئے اسلام میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قومیت کے بھی کچھ جائز اور فطری حقوق ہیں جن کو اسلام نے تسلیم کیا ہے اور ان کے احترام کی تاکید کی ہے۔ بلکہ ان کو اجزائے دین میں شامل کر لیا ہے۔ اس عنوان پر میرا ایک مفصل مضمون[1] میثاق کی پچھلی اشاعتوں میں نکل چکا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو۔ "میثاق" بابت جون و جولائی ۱۹۶۰ء۔

اس کو نکال کر پڑھ لیجئے اس سے بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی قومیت میں فساد اس وقت شامل ہوتا ہے جب یہ بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی بن جائے اور اس کا تعصب یہ جارحانہ اور کافرانہ روپ دھارے کہ "میری قوم" خواہ حق پر ہو یا باطل پر۔ کسی قوم کا اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے لیے متحد اور منظم ہونا یا اس مقصد کے لئے اس کو منظم ہونے کی دعوت دینا نہ کفر ہے نہ نعرۂ جاہلیت۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ بالکل بے سوچے سمجھے ایسا سمجھتے ہیں۔

اگر عرب ترکوں کے خلاف یا ترک عربوں کے خلاف، مصری شامیوں کے خلاف یا شامی مصریوں کے خلاف، افغانی پاکستانیوں کے خلاف یا پاکستانی افغانیوں کے خلاف، مجرد اپنی عربیت یا ترکیت یا مصریت یا شامیت یا افغانیت یا پاکستانیت کے زعم میں نعرہ لگائیں اور اپنی قومیت ہی کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرالیں اور کسی بالاتر اصول حق و عدل کو یا اسلام کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو بلاشبہ ان کی قومیت خلاف اسلام اور ان کا نعرہ، جاہلیت کا نعرہ ہے لیکن اگر ان کے اندر اپنے کسی جائز حق کی مدافعت کے لئے شعور قومیت ابھرے تو یہ اسی طرح جائز بلکہ ثواب ہے جس طرح کسی خاندان کے لوگ اپنے ناموس کی حفاظت کے لئے کسی حملہ آور کے مقابل میں ایک مشترک جذبہ کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

اگر جمال عبدالناصر آج عربی قومیت کا صور اسی مقصد سے پھونکتے جس مقصد سے ایک زمانہ میں ترکوں کو مصر و حجاز سے بے دخل کرنے کے لئے انہی سامراجیوں نے مصر و حجاز اور شام میں پھنکوایا تھا، تب تو بلاشبہ وہ قابل ملامت تھے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت یہ صورت حال نہیں ہے۔ جمال عبدالناصر عربوں کو ترکوں یا افغانیوں یا پاکستانیوں کے خلاف نہیں منظم کر رہے ہیں بلکہ اسرائیل اور سامراجیوں کے خلاف منظم کر رہے ہیں، ان کے پیش نظر اسلام یا مسلمانوں کی مخالفت نہیں بلکہ عرب قوم کی مدافعت ہے، وہ جارح بن کر کسی پر حملہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ مدافع بن کر ایک عظیم خطرہ کے مقابل میں اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے بھی انہیں اسلامی اتحاد کی دعوت ہی کو ذریعہ بنانا چاہیے تھا تو یہ بات کہنے کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں کسی متحدہ اسلامی بلاک کی تنظیم کی راہ میں کتنی ناقابل عبور مشکلات ہیں۔ جب صرف عرب کے متحد ہونے

میں سامراجیوں نے اتنے اڑنگے ڈال رکھے ہیں تو پورے عالم اسلامی کے اتحاد کو وہ بھلا کب ممکن ہونے دینگے جبکہ عالم اسلامی میں سے ایک ایک ملک کی شہ رگ انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے حالات میں جمال عبدالناصر نے اگر اپنے کام کو عرب ہی تک محدود رکھا تو انہوں نے بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنی طاقت و صلاحیت کا انہوں نے صحیح اندازہ کیا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل کی صورت میں جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ براہ راست عرب ہی پر نازل ہوئی ہے۔ اس کا احساس جتنا ان کو ہو سکتا ہے ہم کو اور آپ کو نہیں ہو سکتا۔ ہم اور آپ تو زیادہ سے زیادہ کچھ زبانی ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن ان کے لئے تو یہ موت اور زندگی کا مسئلہ ہے اس وجہ سے عرب میں اگر کچھ رمق باقی ہے تو توقع یہی ہے کہ وہ اس خطرہ عظیم کے مقابل میں متحد ہو جائے گا۔ ورنہ تقدیر کے نوشتہ کو کون مٹا سکتا ہے!

آج جمال عبدالناصر پر فرعونیت کے احیاء کا الزام جو دھرا جا رہا ہے، یہ سب سامراجیوں کا پروپگنڈا ہے۔ پہلے انہوں نے ترکوں کو زک دینے کے لئے قومیت کا یہی افسوں عربوں اور مصریوں کو پڑھایا اور اب جب اس کی زد خود ان پر پڑی ہے تو یہ اسلامیت کے علم بردار بن گئے ہیں۔ جو لوگ بلا تحقیق اس قسم کی باتیں آج پھیلا رہے ہیں میرے نزدیک وہ اسلام کی نہیں بلکہ بلواسطہ اسرائیل کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔ میں جمال عبدالناصر کی اسلامیت کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ میں ان کو اسی قسم کا مسلمان حکمران سمجھتا ہوں جس قسم کے ہمارے اور آپ کے حکمران ہیں۔ مغربیت جس طرح سب کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ان کی گھٹی میں بھی پڑی ہوئی ہے۔ آمر مزاج ہونے کی وجہ سے ان سے بعض شدید قسم کی غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن یہ بالکل ہی لایعنی بات ہے کہ وہ فرعونی تہذیب کے احیاء کے علمبردار ہیں۔ اگر وہ فرعونی تہذیب کے علمبردار ہیں تو ان سے زیادہ نادان کوئی بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس نعرہ کے ساتھ ان کے اتحاد عرب کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ وہ مذہب کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن اپنی سیاست کے تقاضوں کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں نا، جو شخص عدن سے لے کر الجزائر اور مراکش تک کی وحدت کا خواب دیکھ رہا ہو وہ چاہے موسیٰؑ اور محمدؐ کا نام لے یا نہ لے لیکن فرعون کا نام لے کر اپنے ایک حوصلہ مندانہ خواب کو خواب پریشان بنانے کی حماقت تو بہرحال نہیں کرے گا

ترکوں کے خلاف جب مصر وغیرہ میں نسلی قومیت کی تحریک ابھری تھی تو بلاشبہ اس کا مزاج یہی تھا کہ "مصر مصریوں کیلئے ہے" اور "فراعنہ ہمارے بزرگ ہیں"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قومیت کا مزاج بنانے میں عیسائی ادیبوں اور قبطی مفکروں کو بڑا دخل تھا۔ ان کے لٹریچر اور ان کے افکار سے متاثر ہو کر جینٹلمینٹ قسم کے مسلمان بھی اسی قسم کی بولیاں بولنے لگے تھے لیکن یہ زمانہ ماضی کی باتیں ہیں۔ اس قسم کی باتوں کی ذمہ داری آج جمال عبدالناصر پر ڈالنا ہمارے نزدیک انصاف کے خلاف ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ آج جمال عبدالناصر قومیت کے اس تنگ تصور کے ساتھ اتحاد عرب کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سامراجیوں کو پروپگنڈے میں مہارت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اسی قومیت کو ایک زمانہ میں ثواب بتا کر انہوں نے ترکوں کا عرب ممالک سے جنازہ اٹھوا دیا اور آج اس کو کفر بتا کر جمال عبدالناصر کی گردن مروا دینے کے درپے ہیں تاکہ اسرائیل کا جو خنجر انھوں نے امت محمدؐ کے سینے میں پیوست کیا ہے اس وقت تک پیوست ہی رہے جب تک عرب قوم کی جان نہ نکل جائے۔ پھر داد دیجیے ان خوش قسمتوں کی خوش قسمتی پر کہ اس پروپگنڈے میں تعاون کے لئے ہمارے اندر ہی سے ان کو ہر قسم کے آدمی ہاتھ آگئے ہیں۔

تصحیح

۱۔ میثاق بابت مئی ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۳۶ پر قرآن مجید کی جو آیات نقل کی گئی ہیں ان میں آیت ۱۶۳ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ لکھنے سے رہ گئی ہے۔

۲۔ میثاق بابت جون ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۲۷ کی چوتھی سطر میں "سورہ انعام" کے بجائے "سورہ نساء" لکھ لیا جائے۔

مقالات

حافظ نذر احمد صاحب

تاریخِ جمع وتدوین قرآن

قرآن مجید کی جمع و تدوین کی تاریخ اس قدر سادہ اور واضح ہے کہ اسے دو جملوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس میں کوئی گنجلک ہے۔ نہ کوئی تحقیق طلب بات ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اللہ رب العزت کا کلام اس کے بندے ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس کا نزول ماہ رمضان میں آج سے ۱۳۹۲ سال پیشتر شروع ہوا تھا۔ حضور اکرمؐ کی عمر مبارک کا اکتالیسواں سال تھا کہ آپ پر غار حرا میں کلام پاک کی پہلی وحی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ …… العلق کے الفاظ میں اُتری ——— تقریباً ۲۲ سال اور ۳ ماہ کی مدت میں یعنی ہجرت کے تیرھویں سال اس کی تکمیل ہوئی۔ اس کا اعلان اللہ رب العزت نے ان الفاظ میں فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ——— (المائدہ ۳) "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور میں نے تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا"۔

کلام پاک نجماً نجماً نازل ہوا یعنی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں وحی اُتری۔ کبھی ایک آیت کبھی دو چار آیتیں، کبھی مکمل سورت، کبھی کسی سورت کا کوئی حصہ ——— جیسے جیسے کلام اللہ نازل ہوتا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فوراً یاد کر لیتے۔ آپ کو اس کی اتنی کاوش تھی کہ اللہ پاک نے فرمایا لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ——— (القیٰمۃ ۱۶، ۱۷) "اسے پڑھنے کے لئے اپنی زبان تیز نہ چلا کہ تو اسے سیکھ لے۔ اسے جمع کرنا اور

پڑھنا ہمارا ذمہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے صحابہؓ کو قرآن یاد کرا دیتے تھے۔ "اصحاب صفہ" کا شغل علمِ دین کی تحصیل اور ذکر و فکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ قرآن مجید کو حفظ کرنے کا اجر و ثواب اس قدر بتلایا گیا کہ ہر دور میں اُمتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے اندر ہزاروں لاکھوں افراد نے کتاب اللہ کو اوّل سے آخر تک زبانی یاد کیا۔ دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس خصوصیت میں قرآن مجید کے ساتھ شریک نہیں۔ یہ شرف صرف اسی کتاب کو حاصل ہُوا کہ وُہ اوراق کے سفینوں کے علاوہ انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہوئی۔

اہل عرب کا حافظہ غیر معمولی طور پر بہت مضبوط تھا۔ انہیں اپنی یادداشت پر بجا طور پر ناز تھا۔ تاہم حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید نمازوں میں پڑھتے اور صحابہ کو سناتے۔ خود ہر رمضان میں جبرئیل امین سے دَور فرماتے بلکہ عمر مبارک کے آخری رمضان میں دوبارہ دُہراتا ثابت ہے۔

یادداشت کے اس اہتمام کے علاوہ جس قدر کلام پاک نازل ہوتا آپ وُہ کسی پڑھے لکھے صحابی کو بُلا کر لکھا دیتے۔ ان اصحاب کو کاتبانِ وحی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان حضرات میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور پر شامل ہیں:۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ۔ حضرت زید بن ثابتؓ۔ حضرت زبیر بن عوامؓ۔ حضرت عبداللہ بن ارقمؓ۔ حضرت اُبیؓ بن کعب۔ حضرت عامر بن فہیرہؓ۔ حضرت ثابتؓ بن قیس۔ حضرت حنظلہ بن ربیعؓ۔ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان وغیرہ۔۔۔۔۔ ان مستقل لکھنے والوں کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی بطور خود لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ حضرات عام طور پر کھجور کے پٹھوں، چمڑے کی جھلیوں یا اُونٹ کے شانہ کی ہڈیوں سے کاغذ کا کام لیتے تھے۔ بہرصورت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں کلام اللہ منتشر اجزا کی صورت میں ضبط تحریر میں آ گیا۔ گو کسی ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ لیکن متعدد حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔۔۔۔ اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں، خود کلام اللہ اس پر

شاہد عادل ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (الطور: ۱ و ۳) "قسم ہے طور کی۔ اور کشادہ ورق میں لکھی ہوئی کتاب کی۔"

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (الواقعہ ۷۷ تا ۷۹) "یہ عزت والا قرآن ہے چھپی ہوئی کتاب میں لکھا ہُوا ہے۔"

یہی نہیں بلکہ کلام اللہ کا نام ہی "الکتاب" ہے اور اسی نام سے اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرہ ۱ و ۲) "اس کتاب میں کوئی شک نہیں" ——— قرآن مجید کا حضورؐ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مکتوب ہونا کفار کے اس قول سے ثابت ہے:

قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا (فرقان: ۵) "کفار کہتے ہیں یہ تو قصے ہیں پہلے لوگوں کے، جنہیں آپ نے لکھ لیا ہے۔"

اگر کلام اللہ ضبط تحریر میں نہ آ گیا ہوتا تو اسے "الکتاب"، "کتابٌ مسطور"۔ اور "کتابٌ مکنون" کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مختلف اوقات میں نازل ہونے والے حصّوں کی ترتیب خود وحیِ الٰہی کے مطابق ہوئی۔ ارشادِ ربانی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اصل مقام پر لکھنے کا حکم دیتے۔ اسی ترتیب سے خود یاد فرماتے اور اسی ترتیب سے حفاظ صحابہ یاد کرتے اور تلاوت کرتے تھے۔ کلامِ الٰہی کی ترتیب میں کسی انسانی رائے کو دخل نہیں۔ جیسا کہ خود خداوند رب العزت نے فرمایا۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ۔ (القیٰمہ: ۱۷) "اس کا جمع کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔" دربار نبوی کے جملہ کاتبوں کی تعداد ۴۲ بیان کی گئی ہے۔ یہ ۴۲ صحابہ مختلف چیزیں لکھنے کی خدمات انجام دیتے تھے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید کی ترتیب حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہو چکی تھی اور تمام اجزا مکتوب صورت میں موجود تھے۔ مختلف حصّے مختلف اصحاب نے تحریر کئے تھے اور متعدد اصحاب کے پاس موجود تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے خلیفہ مقرر ہُوئے۔ کے زمانہ خلافت کی ایک مشہور جنگ یمامہ ہے۔ جو مسیلمہ

کذاب کے خلاف ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ستر (۷۰) حفاظ شہید ہوگئے۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ اوّل سے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ خدانخواستہ اگر اسی طرح حفاظ شہید ہوتے گئے تو کلام پاک کے تحفظ کا کیا ہوگا؟ آپ نے اُنہیں مشورہ دیا کہ پورا کلام اللہ ایک جگہ لکھا لیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ابتدا میں تامل کیا، جو کام خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، میں کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن اُمت کی مصلحت کے پیش نظر تجویز کو مناسب سمجھ کر آپ راضی ہوگئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس خدمت کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو منتخب فرمایا جب حضور اکرم مدینہ تشریف لائے تھے اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ لیکن کلام پاک سے اس انصاری بچہ کے عشق کا یہ عالم تھا اور ان کے خداداد حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ سترہ (۱۷) سورتیں حفظ کر چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے اس قدر متأثر اور مسرور ہوئے کہ یہود کی زبان عبرانی سیکھنے پر مامور فرمایا۔ انہوں نے چند ہی ایام میں کامل مہارت پیدا کر لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات لکھنے لگے۔ وہ مستقل کاتبانِ وحی میں سے بھی تھے اور اپنے فن میں کامل تھے۔ مؤرخ مسعودی کے بیان کے مطابق زید بن ثابت عربی اور عبرانی کے علاوہ فارسی۔ یونانی۔ قبطی اور حبشی بھی جانتے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: "تم جوان عاقل آدمی ہو۔ ہم تم میں کوئی الزام عیب نہیں پاتے۔ تم حضور علیہ السلام کے کاتب وحی بھی تھے۔ قرآن مجید کو جمع کرو اور لکھ لو۔" زید بن ثابت حضرت ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے اصرار پر اس خدمت کے لئے تیار ہوگئے۔ اگرچہ وہ اس کام میں بطور خاص ماہر تھے اور حافظ قرآن بھی تھے لیکن ذمہ داری آسان نہ تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا: "اگر اس فرض کے بجائے مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی پہاڑ کے منتقل کرنے کا حکم دیا جاتا تو میں اُسے آسان تر سمجھتا۔"

بہر صورت اعلانِ عام کر دیا گیا کہ جس کے پاس قرآن حکیم کا کوئی جزو ہو وہ اسے پیش کر دے۔ چنانچہ جس کے پاس جو کچھ اور جس صورت میں مکتوب تھا، وہ لے آیا۔ لیکن حافظِ قرآن ہونے کے باوجود حضرت زید بن ثابت کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص سے دو حفاظ کی شہادت لیتے کہ یہ نوشتہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ترجمان سے براہ راست سن کر لکھا گیا ہے۔

اس کاوش اور احتیاط کے ساتھ الگ الگ صحیفوں میں مکمل کلام پاک کی کتابت ہوئی۔ اس کام میں مختلف جلیل القدر صحابہؓ نے تعاون کیا۔ یہ مکمل نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تحویل میں رہا۔ ان کے بعد اُن کے جانشین خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حفاظت میں رہا۔ ان کے بعد ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ کی تحویل میں آگیا۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک نئی صورت حال سامنے آئی۔ اس وقت تک اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا۔ متعدد غیر عرب اقوام کلمۂ حق قبول کر چکی تھیں۔ خود عرب کے تمام قبیلے حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ یہ لوگ کلام پاک کی تلاوت اپنے اپنے لہجہ میں کرتے تھے۔ متعدد الفاظ کے لہجہ کی تبدیلی سے تلفظ میں بھی تبدیلی ہو رہی تھی مثلاً صراط کو سراط، صراط اور زراط کی تین صورتوں میں پڑھتے۔ اسی طرح علیہم کو علیہُم بھی پڑھتے ظٰہ کا تلفظ طٰہ بھی کرتے تھے۔ وغیرہ ـــ گو اس وقت تلفظ اور لہجے کی یہ تبدیلی کوئی قباحت نہیں پیدا کر رہی تھی کیونکہ اس سے معانی و مطالب پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ تاہم آگے چل کر نا واقفوں کے اندر اس کے برے اثرات اور اختلافات کا شدید خطرہ ہو سکتا تھا۔

حضرت حذیفہ بن یمان نے آذر بائیجان پر لشکر کشی کے وقت اس اختلاف کو خاص طور پر محسوس کیا۔ اور واپسی پر خلیفہ ثالث کو اس کی اطلاع دے کر تدارک احوال کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ اور فیصلے کے مطابق ام المؤمنین حضرت حفصہؓ سے مصحف منگایا! تاکہ اس سے مزید نقول تیار کرائی جائیں اور اُمت کو ایک قرأت پر جمع کیا جائے۔

اس مرتبہ پھر اس عظیم خدمت کے لئے نظر انتخاب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر ہی پڑی اُن کی سرکردگی میں نقول تیار کی گئیں یہ واقعہ ۲۵ھ کا ہے۔ شریک کار صحابہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ عبداللہ بن عباسؓ۔ عبداللہ بن حارث۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اُبی بن کعب اور حضرت عبدالرحمٰن بن ہشامؓ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب نامکمل تحریریں اور منتشر اجزا تلف کر دیئے گئے اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لہجے اور تلفظ میں یکسانیت پیدا ہوگئی اور قرأت کا اختلاف ختم ہوگیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو چار نقول تیار ہوئیں انہیں تجامع الصحف اور "مصاحف الائمہ" کہا جاتا تھا۔ یہ نسخے مفتوحہ علاقوں میں بھیجے گئے۔ تاکہ جو شخص چاہے ان

مستند مصاحف سے نقول تیار کرے۔ اور ہر کوئی تلفظ قرأت میں قریش کے تلفظ کی پیروی کرے۔ ایک نسخہ کوفہ۔ دوسرا بصرہ۔ تیسرا شام بھیجا گیا۔ اور چوتھا خود اُن کے پاس رہا۔ مزید تین نسخوں کا ذکر بھی آتا ہے جو کہ یمن۔ اور بحرین بھیجے گئے۔

اس کارنامہ کی بنا پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو "جامع القرآن" کہا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی ایک قرأت پر امت کو جمع کرنے والے۔ جامع القرآن سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ انہوں نے کتاب اللہ کی ترتیب و تدوین کی ہے یا کلام اللہ کو جمع کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ کام تو خود حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تنزیل کے ساتھ ساتھ ہو چکا تھا۔

اس وقت تک قرآن مجید میں اعراب (زیر زبر) اور نقطوں کا رواج نہ تھا۔ اعراب کی جگہ بھی کچھ نقطے ہی لگاتے تھے۔ البتہ اُن کے لئے رنگ مختلف استعمال کئے جاتے تھے۔ دراصل عربوں کو اہل زبان ہونے کے اعتبار سے ان سہولتوں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن جوں جوں اسلام غیر عرب اقوام میں پھیلتا گیا ان امور کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔

اموی دور میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کو اس ضرورت کا احساس ہوا چنانچہ عراق کے مشہور گورنر حجاج بن یوسف (متوفی ۹۵ھ) نے قرآن مجید میں اعراب اور نقطے لگوائے۔ اور آیات وغیرہ کے رموز و اوقاف بھی لگوائے۔ یہ خدمت دو مشہور علماء حسن بصریؒ اور یحیٰ بن یعمر نے انجام دی۔ اس سے غیر عرب لوگوں کے لئے تلاوت اور معانی کے سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی ـــ اعراب کو آخری شکل خلیل بن احمد نے دی۔ یہ بزرگ عباسی عہد کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ الحمدللہ آج تک کلام پاک اسی ایک صورت میں پڑھا جاتا ہے اور دنیا بھر کے نسخوں میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ سب "مصحف عثمانی" کے مطابق ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر احسان ہے کہ خود عہد عثمانی کے مصحف آج تک دنیا میں محفوظ اور موجود ہیں ۹ر فروری ۱۹۶۱ء کو اس لاہور شہر میں سفیر روس متعینہ پاکستان ڈاکٹر ایم ایس کپتسانے اپنے بیان میں بتلایا تھا کہ تاشقند میں کلام پاک کا وہ نسخہ موجود ہے جو اپنی شہادت کے وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تلاوت فرما رہے تھے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اپنے دورۂ روس

میں یہ نسخہ دیکھ چکے ہیں۔ سفیر روس نے مزید اعلان کیا تھا کہ عنقریب پاکستان کو اس تاریخی نسخہ کی ایک فوٹو کاپی مہیا کر دی جائے گی۔ (راپ، فروری ۱۹۶۱ء)۔

یہ فقرہ اکثر بزرگوں سے آپ نے سنا ہوگا کہ گذشتہ چودہ صدیوں میں قرآن مجید کا ایک شوشہ تک نہیں بدلا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اور اگر قرآن کی کتابت کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کتابت بھی ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

مثلاً عرض کرتا ہوں قرآن مجید میں ایک لفظ دس جگہ آیا ہے۔ آٹھ مقامات پر وہ ایک انداز میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن دو مقامات پر اس کو مختلف ہجاے لکھا گیا ہے۔ اور دنیا بھر کے ہر نسخے میں اسی انداز سے کتابت ہو رہا ہے۔ حالانکہ بظاہر اس دوسرے طریق کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن قرآن مجید کا ہر کاتب آج بھی چودہ سو سال پہلے کے کاتب اول کی تقلید کرتا ہے۔ کیا مجال کہ کروڑوں نسخوں میں سے کسی ایک نسخہ میں بھی اس جگہ شوشہ بدل جائے۔

امثلہ طاغین .. .. طٰغین ملایھم .. .. ملئھم
الشارق .. .. المشرق ضلال .. .. ضلل
صُفّت .. .. صافات العلماء .. .. العلمٰوا
لأاذبحنه .. .. لاذبحنه

کلام اللہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے مسلمانوں کے والہانہ عشق کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اسے صحیح طور پر پڑھنے اور عربوں کے لب و لہجہ کے مطابق تلاوت کرنے کے لئے تجوید و قرأت کے ایک مستقل فن کی بنیاد ڈالی گئی اس علم پر کتابیں لکھی گئیں۔ اس مقصد وحید کے لئے ہر دور میں لوگوں نے اپنی زندگیاں وقف کیں اور مستقل مکاتب و مدارس قائم کئے۔

قرأت ایک مستقل فن ہے۔ لب و لہجہ اور تلفظ کے اعتبار سے اس کے سات مستقل انداز ہیں جنہیں "سبعہ قراۃ" کہا جاتا ہے۔ ہر قرأت ایک امام سے منسوب ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

۱۔ حضرت امام نافع مدنی رح (متوفی ۱۶۹ھ) مدینہ منورہ

۲- حضرت امام عبداللہ بن کثیر مکیؒ (متوفی سنہ ۱۲۰ھ) مکہ مکرمہ
۳- امام ابوعمرو بن علا بصریؒ (متوفی سنہ ۱۵۴ھ) کوفہ
۴- امام عبداللہ بن عامر شامیؒ (متوفی سنہ ۱۱۸ھ) دمشق
۵- امام عاصم کوفیؒ (متوفی سنہ ۱۲۸ھ) کوفہ
۶- امام حمزہ بن حبیب کوفیؒ (متوفی سنہ ۱۲۶ھ) حُلوان
۷- امام کسائی کوفیؒ (متوفی سنہ ۱۸۹ھ) رَے

ان مشہور سات آئمہ قرأت کے علاوہ تین اور امام ہوئے ہیں۔ یعنی

۸- ابوجعفر یزید مدنیؒ
۹- یعقوب الحضرمی۔ بصرہ
۱۰- خلف بن ہشام بزار کوفی

اس طرح قرآن کریم کی تلاوت کی عشر قرأت یعنی دس طریق تجویز ہوئے۔

آجکل بالعموم ہم سیدنا حفصؒ کی قرأت کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۸۰ھ یا ۱۹۰ھ وفات پائی۔ آپنے قرأت کے پانچویں امام عاصم کوفیؒ سے روایت کی ہے۔

ان سب ائمہ کے شیوخ واساتذہ کے اسمائے گرامی، ان کے راویوں کے اسماء وحالات کتب تاریخ وسیر میں محفوظ ہیں۔ ان کی قرأت کے انداز اور مابہ الامتیاز امور کامل طور پر مسطور ومرقوم ہیں۔ عربی کے علاوہ خود اردو زبان میں اس فن پر درجنوں کتابیں موجود ہیں۔

ماہنامہ میثاق کی جلدیں

دفتر ماہنامہ میثاق رحمانپورہ اچھرہ- لاہور ۱۴ سے حاصل کریں

"میثاق" کے اب تک کے شائع شدہ پرچوں کے خواہشمند حضرات فوراً اپنے آرڈر ارسال فرمائیں۔

اس وقت پانچ چھ شماروں کے سوا تمام پرچے مہیا ہو سکتے ہیں۔ اب تک کل پندرہ شمارے شائع ہوئے ہیں۔ قیمت فی شمارہ ساٹھ پیسے، پرانے یا نئے مستقل خریداروں سے پچاس پیسے۔

اقتباسات وتراجم

جناب خالد مسعود صاحب

سیاستِ نبویؐ کا ایک اہم پہلو

رمضان سنہ ۹ھ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس لوٹ چکے تھے۔ تبوک کا غزوہ وہ تھا جس میں مسلمان روم کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے اور یہ سفر اس زمانہ میں پیش آیا جب گرمی زوروں پر تھی اور ملک میں فصل کاٹنے کی وجہ سے پھل پک چکے تھے۔ یوں تو حضورؐ کی عادت مبارک یہ تھی کہ دشمن کو زک پہنچانے اور لڑائی کی مہم کو کامیاب بنانے کے نقطۂ نظر سے اسکی سمت اور اسکے علاقہ کو مخفی رکھنے کیلئے آپ غزوہ کے راز کو راز میں رکھتے لیکن اس غزوہ کے موقع پر آپؐ نے تبوک جانے کا اعلان فرمادیا۔ اس کے بارے میں ابن ہشام لکھتا ہے:-

"سوائے غزوۂ تبوک کے کہ اس میں آپؐ نے طویل مسافت، موسم کی شدت اور مقابل دشمن کی کثرت کا لحاظ رکھتے ہوئے لوگوں میں اس کا عام اعلان فرمادیا تاکہ لوگ اس کے لئے ضروری سامان ساتھ لے لیں۔ پھر آپ نے تیاری کا حکم دیا اور واضح طور پر بتادیا کہ آپ رُوم کے لئے روانہ ہو رہے ہیں"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فاتح لشکر کے ساتھ واپس لوٹے جسے اللہ تعالیٰ کی شدید آزمائش نے ہلاکر رکھ دیا تھا اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر کے منافقوں اور کمزور ایمان والوں کو چھانٹ دیا تھا۔ سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات ان لوگوں کے نفاق، تردد اور کمزوری ایمان کا ایک ابدی نشان بن گئی ہیں:

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	نہیں رخصت چاہتے تجھ سے وہ لوگ جو
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا	اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اپنے اموال

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالْمُتَّقِيْنَ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُوْنَ ۔ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ
لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ
انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا
مَعَ الْقٰعِدِيْنَ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا
زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا
خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ
سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ

(توبہ ۴۴ ـ ۴۷)

اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کی۔ اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ تجھ سے رخصت تو وہی لوگ چاہتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک میں ڈھلمل یقین ہو رہے ہیں۔ اگر وہ واقعی نکلنا چاہتے تو اس کی تیاری کرتے مگر خدا نے انہیں اٹھانا پسند نہیں کیا، پس اس نے انہیں روک دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو اگر وہ نکلتے تو تمہارے اندر فساد بڑھاتے اور تمہارے درمیان فتنہ پھیلانے کی کوشش کرتے۔ اور تمہارے اندر انکے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

جب حضورؐ ذی اوان میں تھے تو آپ کو خبر پہنچی کہ منافقین کے ایک گروہ نے مؤمنین کی جماعت میں تفریق ڈالنے کی غرض سے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ یہ وہ مسجد تھی جس میں حضورؐ کی تبوک کو روانگی سے قبل منافقوں نے حضورؐ سے نماز ادا کرنے کی درخواست کی تھی اور تعمیر مسجد کا مقصد یہ بتایا تھا کہ "ہم نے اسے مریضوں، احاجتمندوں اور سردی کی بارانی راتوں کے نمازیوں کی خاطر تعمیر کیا ہے۔" اس وقت حضورؐ نے اپنا جواب غزوہ تبوک سے واپسی تک ملتوی فرمایا تھا۔

جب آپؐ کو ذی اوان میں یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو بلا کر حکم دیا کہ ظالموں کی اس مسجد کو جا کر گرا دو اور اسے آگ لگا دو۔ وہ دونوں جلدی سے گئے اور مسجد کو گرا کر آگ لگا دی۔ اسی مسجد اور اس کے تعمیر کنندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا

اور جنہوں نے مسجد بنائی ضرر پہنچانے کے لئے

ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى ۔ وَ
اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔

(توبہ ۱۰۷)

اور کفر کے لئے اور مومنین کے درمیان تفریق ڈالنے کے لئے اور اس شخص کو گھات مہیا کرنے کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑا اور یہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

اس طریقہ سے نبی قائدؐ نے وحدت جماعت کیلئے خطرہ بنے ہوئے نفاق کی سرزنش کے لئے مضبوط قدم اٹھانے کا حکم دیا اور اسے مسلمانوں کے لئے عبرت کا نمونہ قرار دے کر یہ سبق دیا کہ مؤمنین کے دشمنوں کا مسجدیں بنانا اور مظاہر اسلام کو اختیار کرنا نبیؐ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں پا سکا بلکہ اس کا غضب ان کے مظاہر اسلام کے اختیار کرنے کی نسبت ہی سے زیادہ ہوا اور نبیؐ نے ان مظاہر کی بیخ کنی میں بھی پوری درشتی سے کام لیا۔ قرآن کریم نے بھی منافقین کی قسموں کو جھٹلا کر ان کی خباثت کو نمایاں کیا ہے۔ فرمایا

وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔

(توبہ ۱۰۷)

اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد قبائل طائف کا نمائندہ وفد ثقیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت اور قبول اسلام کی غرض سے آیا۔ ان کی شرط یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مطالبات منظور فرمائیں اور ان کی قوم، ان کے علاقوں اور اموال کے بارے میں انہیں خصوصی پروانہ لکھ کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ملاقات کی اور ان کی شرائط سنیں۔ ان میں ایک شرط ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ تھی کہ "ان کے قبیلہ کے بت "لات" کو ان کے لئے باقی رہنے دیا جائے اور تین سال کی مدت تک اسے نہ گرایا جائے"۔

وفد ثقیف کی دلیل یہ تھی کہ جب تک ان کی قوم اسلام نہیں لے آتی، وہ اس کے بت کو توڑ کر اسے دہشت میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ اس مدت کو سالوں سے گھٹاتے گھٹاتے ایک ماہ تک لے آئے

لیکن حضورؐ نے دو ٹوک فرما دیا کہ آپ ہدم لات کے لئے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کو تیار نہیں، خواہ یہ مدت ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد وفد ثقیف نے درخواست کی کہ انہیں نماز معاف کر دی جائے اور ان پر یہ پابندی نہ لگائی جائے کہ وہ اپنے بتوں کو اپنے ہی ہاتھوں توڑیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا! "جہاں تک اپنے ہاتھوں بتوں کے توڑنے کا تعلق ہے، ہم تمہیں اس کی معافی دیں گے لیکن جہاں تک نماز کی معافی کا تعلق ہے، یاد رکھو کہ جس دین میں نماز نہیں اس دین میں کوئی خیر نہیں"۔ پھر آپؐ نے حضرت ابوسفیان بن حربؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ کو متعین کیا انہوں نے وہاں جا کر لات کو توڑا۔ پھر حضورؐ نے حضرت عثمان بن ابوالعاصؓ کو ان کی صغر سنی کے باوجود صرف اس لئے ثقیف کا امیر مقرر کر دیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ "یا رسول اللہ! میں نے ان لوگوں میں سے اس لڑکے کو اسلام کے سمجھنے اور قرآن سیکھنے میں سب سے زیادہ حریص پایا ہے"۔

اس واقعہ میں ہم دوسری مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست میں مضبوط فیصلہ کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ ایک "المعبود من دون اللہ" کی بیخ کنی میں تاخیر کی اجازت نہ دے کر دوسرے فرض نماز کا حکم دینے میں۔ پھر عثمان بن ابوالعاص کو ان کی صغر سنی کے باوجود محض ان کے تعلیم قرآن اور تفقہ فی الاسلام کے شوق کے پیش نظر ثقیف کا امیر مقرر کر دینے میں بھی ہمیں حضور کا حتمی فیصلہ نظر آتا ہے جو آپؐ نے ایک نبی کے مخصوص معیار انتخاب پر انہیں جانچ کر کیا۔

ہمارے اہل سیاست جب سیرت النبیؐ کے اس پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں خیال ہوتا ہے کہ ہدم لات میں ذرا سی تاخیر گوارا کر لینے میں آخر کیا حرج تھا، جب کہ ایک نہ ایک دن اسے منہدم ہونا ہی تھا؟ اگر یہ تاخیر گوارا کر لی جاتی تو اہلِ طائف کے جذبات اور زیادہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے۔ اسی طرح اگر کچھ عرصہ کے لئے نماز معاف کر دی جاتی تو اس سے کیا نقصان ہوتا جبکہ ان لوگوں میں اسلام ابھی نیا نیا داخل ہو رہا تھا؟ امیر کے تقرر میں بھی ہمارے ان اہل سیاست کو ایک چیلنج نظر آتا ہے جو وفد ثقیف کے مسلّمہ معیار سیادت کو دیا گیا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نبی کی سیاست اس طرح کی حکمت عملیوں پر مبنی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسے زندہ اور واضح عقیدہ سے پھوٹتی ہے جو حق کے معاملہ میں نمائشی رواداری سے کام نہیں لیتا۔ یہ اس واضح اور کامل پیغام پر مبنی ہوتی ہے جس کے اٹھانے کے اہل صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دلوں میں اس کی جڑیں اچھی طرح راسخ ہو چکی ہوں اور وہ اس کے معاملہ میں کبھی متزلزل نہ ہوں۔ جب معاملہ عقیدہ توحید کا ہوتا ہے اور یہ حقیقت پیش نظر ہوتی ہے کہ یہ عقیدہ خدا کے ساتھ کسی بُت کی پرستش اور کسی طاغوت کے خوف سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا تو آپ کو نبی کی سیاست میں بناوٹ اور رواداری کی تعبیروں کا سراغ نہیں ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے داعی کسی نرمی یا رخصت پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم نے اسی واقعہ میں دیکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد ثقیف کو اتنی رعایت دی کہ خود ان کے اپنے ہاتھوں بُت کو نہیں تڑوایا۔ ان کو نرمی سے حقیقت سمجھائی حتیٰ کہ انہوں نے حضورؐ کی بات مان لی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح رہے کہ اگرچہ حضورؐ نے ان کے ساتھ نرمی بھی کی اور انہیں رعایت بھی دی لیکن جہاں تک بتوں کے توڑنے اور اس میں تاخیر نہ کرنے کا تعلق ہے آپؐ اپنے عزم پر قائم رہے اور اس کو قربان نہیں ہونے دیا۔

(المسلمون)

اعلان

"میثاق" کے مندرجہ ذیل شماروں کی شدید ضرورت ہے

جون۔ جولائی۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء

جنوری ۱۹۶۱ء اور جنوری ۱۹۶۲ء

○ جن خریداروں اور ایجنٹوں کے پاس یہ پرچے فاضل موجود ہوں وہ دفتر کو بھیج کر ان کی قیمت حاصل کر لیں۔

منیجر: ماہنامہ "میثاق" رحمانپورہ
اچھرہ۔ لاہور ۱۲

بقیہ مضمون صفحہ ۸ سے آگے

"تذکرہ و تبصرہ"

اس وجہ سے کسی باایمان سنی کے لئے ان کی کسی قسم کی توہین برداشت کرسکنا ناممکن ہے اور اس معاملہ میں کسی قسم کی رواداری برتنا کفرونفاق ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر شیعہ سُنی فسادات کے سدباب کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ان بزرگوں کی توہین کے تمام امکانات کا حتمی طور پر سدباب کر دیا جائے۔ یہ ظاہر کرنیکی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے اس مطالبہ کا تعلق حضرات شیعہ کی نجی مجالس و محافل سے نہیں ہے۔ وہ اپنی نجی مجالس میں جو چاہیں کریں اور کہیں لیکن پبلک میں اس قسم کی کسی حرکت کی گنجائش کسی کے لئے بھی نہیں ہونی چاہیئے۔

یہ ظاہر کرنیکی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے یہی جذبات حضرت علیؓ حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور تمام اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین کے لئے بھی ہیں۔ ان کی محبت بھی ہمارے لئے جزو ایمان ہے۔ ہم ان کی محبت کے غیر مشروط طور پر پابند ہیں۔ شیعہ حضرات کا رویہ حضرات شیخینؓ اور دوسرے صحابہؓ کے معاملہ میں خواہ کچھ ہی رہے ہمارا رویہ اہل بیت سادات کے معاملہ میں کبھی بدل نہیں سکتا۔ اگر ہمارے سینے ان کی محبت سے خالی ہوجائیں تو یہ ایمان سے خالی ہوجانا ہوگا۔ ہر سُنی اس معاملہ کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا ہے اس وجہ سے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی اشتعال انگیز سے اشتعال انگیز موقع پر بھی کوئی سنی اہل بیت اطہار کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہہ سکے۔ کہہ سکنا تو درکنار اس کا تصور بھی کرسکے۔ خلوت ہو یا جلوت۔

ہمارے نزدیک اصل بنیادی مسئلہ یہی ہے جس کا حل سوچنا ہے۔ اور یہ کام اب حکومت ہی کے کرنے کا ہے۔ علاوہ اس کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں یا کرنی چاہئیں اس بارے میں ہم اپنی طرف سے کوئی مشورہ دینا نہیں چاہتے۔ اس سلسلہ میں بعض مفید اور معقول تجویزیں اخبارات میں آئی ہیں وہ حکومت کے علم میں ہیں۔ حکومت اگر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہے گی تو ان تجاویز سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اور ان کے علاوہ بھی بعض مؤثر شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

تقریظ و تنقید

نظامِ صلاح و اصلاح

تالیف: مولینا عبدالباری ندوی سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی

ضخامت: ۲۸۷ صفحات قیمت ساڑھے تین روپے

ناشر: ادارہ مجلس علمی، پوسٹ بکس نمبر ۳۸۸۳ کراچی

اس کتاب کے مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اپنے علمی و دینی مشاغل اور خلوص و للّٰہیت کی بنا پر ملک کے اہل علم میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی تصنیف "نظامِ صلاح و اصلاح" آپ کی بزرگانہ نصیحت اور فیض رسانی کا ایک مظہر ہے۔

یہ کتاب بظاہر تو سورۃ العصر کی تفسیر کے طور پر لکھی گئی ہے لیکن مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں اس کتاب کے ذریعہ مصنف محترم نے مسلمانوں کا حق نصیحت ادا کیا ہے۔ ان کے پیش نظر "خیر امت" کے عظیم منصب کے تقاضے بھی ہیں اور ملت کی تہی دامنی اور درماندگی کا احساس بھی۔ انہیں اپنے امراء، عوام اور علماء و مشائخ سب کے اندر سے ایمانی روح مفقود ہوتی نظر آتی ہے اور جو چیدہ ہستیاں اپنے فرائض ادا کر رہی ہیں ان کے وجود کو وہ دین کے تقاضوں کے اعتبار سے بالکل ناکافی سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر فاضل مصنف نے قوم کو بیدار کرنے کی قابل تحسین کوشش کی ہے۔

اس طرح کے موضوع پر عموماً جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں لوگ قوم کی بے حسی اور معاشرتی اقدار کی تبدیلی کا رونا رونے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن زیر نظر کتاب ایسی نہیں ہے۔ اس میں محترم مصنف نے قوم کی بے حسی کا تجزیہ کیا ہے اس کے اسباب کا کھوج لگایا ہے اور اس کو ختم کرنے اور مسلمانوں میں معروف و منکر کا شعور بیدار کرنے کے لئے قابل عمل تجاویز پیش کی ہیں۔

اس سلسلہ میں مصنف محترم نے ان دینی جماعتوں کا بھی جائزہ لیا ہے جو قوم کی اصلاح کیلئے ملک میں سرگرم عمل ہیں اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مصنف جس چیز کو سب سے زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں وہ ایک مستحکم مثالی معاشرہ کا قیام ہے۔ ان کے نزدیک ایسے معاشرہ کے قیام کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں موجود نہیں ہیں۔ ضرورت جس امر کی ہے وہ یہ ہے کہ علماء کا طبقہ اس کے لئے جدوجہد کرے اور ایک ایک گھر کی ہمہ گیر اصلاح کو مقصد بنایا جائے۔ یہ گھریلو اصلاح خواہ ایک مختصر سے خطے کا سے شروع ہو لیکن اسے کماً وکیفاً معقول حد تک ہونا چاہئے۔

ہم محترم مصنف کے نتائج فکر سے اتفاق رکھتے ہیں ہمارے نزدیک بھی ملت کی اصلاح کا فطری راستہ یہی ہے کہ فرد کی اصلاح کے نتیجہ میں صالح معاشرہ پیدا کیا جائے اور ایسے علماء پیدا کئے جائیں جو موجودہ دور کے تقاضوں اور نئے مسائل کو سمجھتے ہوئے دعوت دین کا یہ کام سرانجام دے سکیں۔ یہ جدوجہد جب تک ہر پہلو سے متوازن نہ ہوگی اس وقت تک اس سے صالح نتائج پیدا نہ ہو سکیں گے۔

ہم قارئین سے اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے اندر اقامتِ دین کا ولولہ پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔

کتاب مجلد ہے اور سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

(خ-م)

مکتبۂ میثاق

دینی اور علمی کتابوں کا ایک مرکز

یہ مکتبہ آپ کو دوسرے کتب خانوں کی کتابیں بھی مہیا کر سکتا ہے۔ یہاں آپ کی فرمائشوں کی تعمیل فی الفور کی جاتی ہے۔

مکتبۂ میثاق رحمانپورہ، اچھرہ لاہور ۱۲

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔

چند مفید کتابیں

احسن التفاسیر اردو دو جلد	مولانا سید احمد حسن	۲۲/—
الجمال والکمال	مصنفہ علامہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری	۶/—
رسول اکرم صلعم کی سیاسی زندگی	مصنفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ	۸/—
انسان کامل	ترجمہ مولوی فضل میران	۱۰/۷۵
عرب دنیا	ترجمہ ڈاکٹر محمود حسن	۱۲/—
زینب بنت زہراؓ	مصنفہ محمد وارث کامل مرحوم	۳/۵۰
غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	۶/—
یادگار آزاد رحمہ	خالد بزمی	۳/—
عمر بن عبدالعزیز رحمہ	مولانا عبدالسلام ندوی	۳/—
البلاغ المبین فارسی	شاہ ولی اللہ	۲/—
تحفۃ الموحدین	شاہ ولی اللہ	۰/۶۳
صلوٰۃ الرسول	مولانا صادق سیالکوٹی	۳/—
حج مسنون	,,	۳/—
ضرب حدیث	,,	۳/—
ریاض الاخلاق	,,	۵/—
اعجاز حدیث	,,	۳/۵۰
قرآنی شمعیں	,,	۳/—
سید الکونین صلعم	,,	۵/—

ان کے علاوہ بھی دیگر علمی۔ ادبی اور عربی و فارسی کتب ہم سے بارعایت خرید فرمائیں۔

المکتبۃ الرحمانیہ ۱۲ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور